کتب تفاسیر میں اسرائیلی روایات

تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

ڈاکٹر محمد ہمایوں عباس شمس

سنگت پبلشرز، لاہور

باذوق قارئین کیلئے

بامقصد

خوبصورت

اور معیاری

کتابوں کی سنگت فراہم کرنے والا

منفرد اشاعتی ادارہ (سنگت پبلشرز 7358741)

ضابطہ

جملہ حقوق محفوظ

نگرانِ اعلیٰ (اعزازی)	محمد عباس نجمی
منتظم (اعزازی)	محمد عاصم ندیم
اہتمام	زین العابدین عامر
سال اشاعت	ستمبر 2004ء
قیمت	80/-

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱۔	تقریظ	۱
۲۔	اسرائیلیات-ایک جائزہ	۴
۳۔	اسرائیلیات (مفہوم)	۱۱
۴۔	اسرائیلیات کی اقسام	۱۲
۵۔	تفسیر اور اسرائیلی روایات	۱۳
۶۔	اسرائیلیات اور معروف روات	۱۵
۷۔	کتب تفاسیر اور اسرائیلی روایات	۱۶
۸۔	امام رازی کا اسرائیلیات کے بارہ میں مؤقف	۱۸
۹۔	علامہ یوسف القرضاوی کا اسرائیلیات کے بارہ میں مؤقف	۲۲
۱۰۔	ابن کثیر کا اسرائیلیات کے بارہ میں مؤقف	۳۳
۱۱۔	شاہ ولی اللہ کا اسرائیلیات کے بارہ میں مؤقف	۳۴
۱۲۔	محمد ابوزھو کا نظریہ	۳۵
۱۳۔	حضرت سیدنا آدم علیہ السلام	۳۷
۱۴۔	حضرت سیدنا آدم علیہ السلام کا دعا نہ کرنا	۵۱
۱۵۔	تعمیر کعبہ	۵۳
۱۶۔	حضرت داؤد علیہ السلام اور دنبیوں کا قصہ	۶۹
۱۷۔	سیدنا موسیٰ علیہ السلام اور زبان کی لکنت	۷۵

۱۸۔	...ئل تعمیر کرنے کا فرعونی حکم	۷۷
۱۹۔	حضرت ایوب علیہ السلام کے جسم اطہر میں کیڑوں کا افسانہ	۷۹
۲۰۔	عون بن عنق	۸۱
۲۱۔	قصہ ہاروت وماروت	۸۵
۲۲۔	حضرت سلمان اور اسرائیلی قصے	۸۹
۲۳۔	حضرت سیدنا یوسف علیہ السلام	۹۴
۲۴۔	حضرت یوسف علیہ السلام کیلئے خفیہ تدبیر	۹۹
۲۵۔	حضرت یوسف علیہ السلام کو فروخت کرنا	۱۰۱
۲۶۔	حضرت یونس علیہ السلام اور اسرائیلی قصے	۱۰۳
۲۷۔	مائدہ پر کون سے کھانے تھے؟	۱۰۶
۲۸۔	ماخذ ومراجع	۱۰۸

-☆-

تقریظ

☆ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی

علوم اسلامیہ پر تالیف وتصنیف کرنے والوں کے سامنے متعدد علمی تقاضے ہوتے ہیں۔ ان سے عہدہ برآ ہونا خاصا مشکل کام ہے۔ اول اسلام اور اس کے دینی تقاضوں سے واقفیت لازمی ہوتی ہے۔ ان کا ایک سرا علم وتحقیق سے جڑا ہوتا ہے تو دوسرا دین وعقیدے میں پیوست ہوتا ہے۔ بالعموم دوسرا تقاضا اتنا ضروری تصور نہیں کیا جاتا بلکہ اسے غیر ضروری اسلامی بنیاد پرستی کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔ مستشرقین اور دوسرے غیر مسلم اور غیر دینی اہل علم کی تالیف وتصنیف میں اسی بناء پر دینی تقاضوں سے ہم آہنگی کا عنصر مفقود ہوتا ہے۔ علم وتحقیق کا ایک تہذیبی پس منظر ہوتا ہے جس کا خمیر دین ومذہب سے اٹھتا ہے۔ اسلام، دین، قرآن، حدیث اور دوسرے علوم اسلامیہ کی تفہیم وافہام ہی ممکن نہیں جب تک اس تہذیبی پس منظر سے واقفیت نہ ہو، اتنی جتنی کہ عربی زبان وادب پر قدرت اور فنی بصیرت سے بہرہ مندی ناگزیر ہے۔ اسی کو جدید علمی اصطلاح میں سچے تناظر (real perspective) سے تعبیر کیا جاتا ہے یا کیا جانا چاہیے۔ علمی وتحقیقی دنیا میں استشراق کے غلبہ اور مغربی محققین کے تفوق نے معروضی مطالعہ کا ایک اصول قائم کیا ہے۔ اسے تنقیدی مطالعہ وبصیرت بھی قرار دیا جاتا ہے۔ مگر معروضیت کا مطلب حقائق وشواہد سے روگردانی، انحراف یا ان کی تنسیخ نہیں ہے۔ معروضیت تو حقیقتوں کے عرفان سے پیدا ہوتی ہے اور تنقیدی ومعروضی پیشکش اس کی پیدا کردہ بصیرت اور فنی نظریہ کے مطابق صحیح صورت واقعہ کی بازیافت، تعبیر وتشریح اور پیشکش ہے۔

☆ادارہ علوم اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، انڈیا

بظاہر یہ علمی معیار اور تحقیقی کسوٹی بشری طاقت سے ماوراء نظر آتی ہے لیکن اسلامی عبقریات نے اس کو خالص انسانی کاوش بنا کر دکھا دیا ہے۔ ان میں سرفہرست محدثین کرام کا عظیم الشان طبقہ ہے، مفسرین، اہل سیر، فقہاء، متکلمین، فلاسفہ، ادباء اور متعدد دوسروں نے اپنی بساط بھر کوشش کی ہے۔ اسلامی معیار علم و تحقیق اور معیار فضیلت و تدقیق زوالِ علم و علماء کے ساتھ گرد آلود ہو کر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور موجودہ مسلمانوں کی علمی ابتری نے اس کو قصہ پارینہ بنا دیا۔ لیکن اہل اسلام میں ابھی بھی بہت سے صاحبان علم و نظر ہیں جو عبقریاتِ ماضی کے ہمدوش وہم پلہ اور ہم سر قرار دیے جا سکتے ہیں اور حقیقتاً ہیں بھی۔ اہل مغرب نے اور دوسرے محققین نے اسی اسلامی سرچشمہ فیض سے کسب کیا ہے۔ ان کا اکتساب بہر حال جزوی ہے اور اسلامی نگاہ و تبحرِ علمی سے محروم بھی۔ بہر حال وہ آج بھی معیار فضیلت ہے اور آدرش و نصب العین بھی جس تک پہونچنا ہر صاحب قلم و علم کا بنیادی مطمع نظر ہوتا ہے۔

ڈاکٹر محمد ہمایوں عباس شمس پاک و ہند کے ان اہل قلم میں ہیں جن کو مبدأ فیاض کی درگاہِ علم و دین سے حصہ وافر ملا ہے۔ ان میں دینی حمیت و صلاحیت بھی ہے، علمی تحقیق و فنی کدوکاوش کی بصیرت بھی۔ عربی زبان و ادب سے ان کی ضروری واقفیت، علوم اسلامی سے ان کے گہرے شغف اور مصادر علم و تحقیق پر ان کی ماہرانہ گرفت نے ان کو مطالعہ، تحقیق اور تالیف کا صحیح تناظر بخشا ہے۔ ان کے مذاق کی شفافیت اور ذوق کی رنگارنگی نے ان کو متعدد علوم و فنون پر لکھنے کا حوصلہ دیا ہے۔ ان کے لکھنے کی دو سطحیں ہیں: ایک عام دینی موضوعات اور اخلاقی مضامین پر اصلاحی مضامین، کتابچے اور تالیفات مرتب کرنا، دوسرے خالص علمی موضوعات پر تحقیقی مقالات اور کتابیں تالیف کرنا۔ ان دونوں کے غائر اور سچے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ سچے لکھنے والے ہیں۔ ان میں دینی ہمدردی، علمی صلابت اور تحقیقی ذوق موجود ہے۔ وہ علماء، فقہاء، محدثین

اور دوسرے اہل علم کی تمام تر یا بیشتر متعلقہ آراء، افکار، تجزیاتی مطالعات اور تنقیدی تحقیقات پیش کر کے اپنا محاکمہ دیتے ہیں اور زیر بحث موضوع کو خوب مدلل، مفصل اور محکم پیش کرتے ہیں۔ تنقیدی و تجزیاتی مطالعات میں ایک نکتہ پر تمام آراء وافکار کا پیش کرنا طوالت واطناب کا موجب ضرور ہوتا ہے مگر تنقیح و تحلیل او تجزیے میں ان سے مدد ملتی ہے اور قارئین کے سامنے مآخذ کی معلومات بھی رہتی ہیں۔ صرف تجزیہ نگار کا محاکمہ نہیں رہتا۔ تجزیاتی مطالعہ میں ایک زیادہ کارگر طریقہ یہ ہے کہ تجزیہ کے بیانیے ہی میں تمام آراء وخیالات کو آمیخت کر دیا جائے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف ہمارے ان اہل علم میں ہیں جن سے اسلامی مطالعات کا بھرم قائم ہونے کی امید ہے اور اسلامی آدرش پھر سے زندہ اور روبعمل ہونے کی پکی توقع۔ اللہ تعالیٰ ان کو علم نافع عطا فرمائے اور ہم کو اس سے استفادہ کی توفیق۔

خادم علم وعلماء
محمد یاسین مظہر صدیقی

ادارہ علوم اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، انڈیا

اسرائیلیات - ایک جائزہ

☆ حافظ محمد سجاد ترالوی

قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے، یہ کتابِ ہدایت اسلام کا مرجعِ اول ہے۔ اسلام کی تمام تعلیمات خواہ ان کا تعلق عقائد وتصوارت سے ہوں یا اقدار ونظریات سے، دینی شعائر وعبادات کی تعلیمات ہو یا اخلاق وآداب کی تفصیلات، قوانین ہوں یا سیاست ومعاشرت کے اصول وکلیات، ان سب کے بارے میں اس کتاب، ھُدیٰ اور پیغامِ لاریب میں جامع وکامل تعلیمات موجود ہیں۔

ائمہ فن تفسیر اور مفسرین عظام نے قرآن حکیم کے مطالب ومعانی کو مختلف علوم میں تقسیم کیا ہے اور اس کے اسرار ورموز، حکمت وفصاحت وبلاغت، اعجاز پر عمدہ تحقیقات امت کے سامنے پیش کیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (۱۱۱۴ھ-۱۱۷۶ھ/۱۷۰۳ء-۱۷۶۲ء) نے قرآن حکیم کے علوم ومعارف کو پانچ مضامین میں تقسیم کیا ہے اور بتایا ہے کہ پورا قرآن حکیم پانچ علوم پر مشتمل ہے۔ ان میں

۱۔ علم الاحکام ۲۔ علم المخاصمہ

۳۔ علم تذکیر بآلا اللہ ۴۔ علم تذکیر الموت وبعد الموت

۵۔ تذکیر بایّام اللہ (الفوز الکبیر فی اصول التفسیر)

شامل ہیں۔

تذکیر بایّام اللہ سے مراد شاہ صاحب نے امم سابقہ کے حالات وواقعات کو قرار دیا

☆ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ افکار اسلامی، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد

ہے کہ قرآن حکیم نے گذشتہ اقوام وملل کے احوال وآثار اور انبیاء ورسل کے واقعات کو بیان کیا ہے اور اس کا مقصد عبرت ونصیحت ہے۔

قرآن حکیم بنیادی طور پر ہدایت ونصیحت کی کتاب ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

۱۔ ان هو الا ذكر للعالمين. (يوسف۱۲:۱۰۴)

۲۔ وهذا ذكر مبارك أنزلناه (الانبياء۲۱:۵۰)

۳۔ إن هو الاّ ذكر و قرآن مبين (يسين۳۶:۲۹)

۴۔ صٓ، والقرأن ذى الذكر (ص۳۸:۵۱)

۵۔ هذا بيان للناس وهدى وموعظة للمتقين (آل عمران۳:۱۳۸)

۶۔ قدجاء تكم موعظة من ربكم. (يونس۱۰:۵۷)

مندرجہ بالا آیات کریمہ میں اس کتاب مبین کی جو صفات بیان کی گئیں ہیں ان میں ذکر ونصیحت، ہدایت وموعظت بڑی نمایاں ہیں۔ بلاشبہ اس میں تمام علوم ومعارف کے خزانے بھی جمع ہیں مگر اس کا غالب پہلو دعوت، نصیحت، ہدایت وراہنمائی کا ہی ہے۔

اس مقصد کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں گذشتہ انبیاء ورسل اور ان کی اقوام کے حالات بیان کیے ہیں۔ قرآن حکیم کیونکہ عربوں میں نازل ہوا، اس لیے قرآن حکیم میں ان مشہور واقعات کو ہی بیان کیا گیا جن سے پہلے عرب واقف تھے۔

تذکیر بایام اللہ کے بارے میں قرآن مجید کا اسلوب یہ ہے کہ وہ ان قصوں کی تمام جزئیات کو بیان نہیں کرتا بلکہ اُن پہلوؤں کی نشاندہی کرتا ہے جن سے کوئی خاص پیغام دینا مقصود ہو یا اس سے کوئی عبرت ونصیحت حاصل ہوتی ہو۔ بقول حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی:

"ان قصص کے بیان کا اصل مقصد یہ ہے کہ سامع کے ذہن میں شرک اور گناہوں کی

برائی سے نفرت پیدا ہو جائے اور وہ یہ سمجھ لیں کہ کفار پر اللہ کا عذاب آتا ہے اور مخلص بندے اس کی مدد سے محفوظ رہتے ہیں۔"

قرآن حکیم میں گذشتہ اقوام وملل اور انبیاء ورسل کے واقعات بڑے مجمل بیان ہوئے ہیں۔ اہل ایمان اس کی تفصیلات کے لیے اہل کتاب مسلمان علماء سے پوچھتے تھے۔ جن کو یہودی مذہب کی روایات معلوم تھیں۔ اس طرح وہ پورے قصے کی جزئیات جان لیتے۔ مگر ان قصے کہانیوں میں کثرت سے ایسا مواد درکر آیا جو اسلامی فکر ونظریہ سے مطابقت نہیں رکھتا تھا اور متقدمین مفسرین نے اپنی تفاسیر میں ان تمام روایات کو بلا تحقیق ونقد کے شامل کر لیا۔ اس طرح وہ اسرائیلی روایات کتب تفسیر میں بکثرت ملتی ہیں۔ چنانچہ تفسیر قرآن سے متعلق ایک اہم بحث یہ رہی ہے کہ قرآن مجید کی تفسیر وتشریح کے سلسلہ میں کس حد تک اسرائیلیات پر اعتماد کیا جائے اور کہاں تک ان کو استعمال کیا جائے۔

"اسرائیلیات سے مراد وہ روایتیں ہیں جو اسرائیلی ذرائع سے ہم تک پہنچی ہیں۔ بعد میں یہ اصطلاح اور زیادہ عام ہوگئی اور تمام من گھڑت روایتوں کے لیے استعمال کی جانے لگی خواہ ان کے راوی یہودی ہوں یا کوئی اور۔"

اسلام کی آمد سے قبل ہی یہودیوں کے ذریعہ امم ماضیہ کے سلسلہ میں عربوں کے درمیان بہت سی حکایتیں مشہور ہو چکی تھیں۔ چونکہ ان کا تعلق انبیاء وصلحاء سے تھا اس لیے نزول قران کے بعد اس میں وارد بہت سے قصص کی وضاحت اور تفصیل کے لیے ان سے رجوع کیا گیا۔

تفسیری سرمائے میں اسرائیلیات کا نفوذ اور اس کی آمیزش کا آغاز تو ابتداء اسلام یعنی صحابہ وتابعین کے زمانے ہی سے ہو چکا تھا جن میں زیادہ کردار اہل کتاب صحابہ کرام کا ہے۔

دوسرے مسلمانوں نے بھی یہود ونصارٰی کی کتابوں سے متاثر ہو کر اس طرح کی بہت سے چیزیں اپنے یہاں شامل کرلیں۔

علامہ ابن خلدون نے اسرائیلیات کی اسلامی روایات میں دخل اندازی کی جو صورت حال بیان کی ہے اُس کی تفصیلات حسب ذیل ہیں:

''متقدمین نے جب تفسیر کی کتابوں کو مدّون کیا تو ان کے سامنے روایات کا جو ذخیرہ تھا وہ سب کا سب بلا تحقیق صحت اپنی کتابوں میں لے لیا۔ اس کی ایک خاص وجہ تھی اور وہ یہ کہ اہل عرب نہ تو کبھی اہل کتاب رہے اور نہ کبھی ان میں علم ہی رہا۔ ان پر ہمیشہ بدویت وامیّت غالب رہی جس طرح ناخواندہ لوگوں کو کائنات کے بارے میں جاننے کا شوق اور معلومات حاصل کرنے کا جذبہ ہوتا ہے اسی طرح وہ بھی یہ جاننا چاہتے تھے کہ یہ دنیا کیسے پیدا ہوئی؟ یہ سورج یہ چاند یہ ستارے کیا ہیں؟ یہ زمین وآسمان کب اور کیسے بنائے گئے وغیرہ وغیرہ۔ عربوں کے پڑوس میں پڑھا لکھا طبقہ اہل کتاب یہودیوں اور نصرانیوں کا تھا۔ عام یہودی بھی عربوں کے ساتھ بدویانہ ہی زندگی گذارتے تھے۔ اس لیے ان کی معلومات ویسی ہی تھیں جیسی عوام کی معلومات ہوسکتی ہیں۔ ان میں اہل حمیر کو البتہ خصوصیت حاصل تھی جو دین یہودیت قبول کر چکے تھے۔ پھر اسلام آیا اور ان تمام لوگوں نے اسلام قبول کرلیا۔ ان کے ذہنوں اور حافظوں میں جو پہلے کے سنے سنائے قصے پڑے ہوئے تھے علی حالہ باقی رہے کیونکہ ان کا تعلق احکام شرعیہ سے نہیں تھا۔ یہ تخلیق عالم کی داستانیں، بادشاہوں کی جنگوں اور عربوں کی آپس کی لڑائیوں کی کہانیاں تھیں یا اسی طرح دین وشریعت سے غیر متعلق دوسرے قصے اور واقعات تھے۔

اسلام لانے کے بعد ان لوگوں نے اپنی مجلسوں میں اپنے آباء واجداد سے سنے ہوئے قصوں کو مسلمانوں میں بیان کرنا شروع کر دیا۔ اس بیان کا باعث فساد عقیدہ نہیں تھا بلکہ بطور

قدیمی داستان کے اس کو بیان کرتے تھے۔ بعد میں جب تفسیر کی کتابیں مرتب ہونے لگیں تو یہی قصے اور داستانیں ان موقعوں پر درج کر دی گئیں جہاں قرآن نے واقعات وقصص کو مجمل طور پر بیان کیا ہے۔ چونکہ ان واقعات کا احکام سے کوئی تعلق نہیں تھا اس لیے اس کی صحت کی زیادہ تحقیق نہیں کی گئی کیونکہ ان پر اعتماد رکھنا یا ایمان لانا، ان پر عمل کرنا ضروری نہ تھا۔ اس لیے مفسرین نے اسے قبول کر لیا اور کتابوں میں درج کر دیا حالانکہ ان تمام روایتوں کا سرچشمہ درحقیقت وہی یہودی ہیں جو بدویانہ زندگی گذار رہے تھے۔ ان واقعات کے سلسلہ میں بیان کرنے والوں اور سننے والوں کو کچھ پتہ نہ تھا کہ حقیقت کیا ہے اور کہاں تک یہ صحیح ہے۔ اس کے باوجود یہ روایتیں مشہور ہو گئیں کیونکہ وہ خود مسلمان ہونے کے بعد قابل عزت سمجھے جاتے رہے اس لیے ان کی روایتوں کو قبول کر لیا گیا۔ (مقدمہ ابن خلدون (۴۹۰-۴۹۱)

اسرائیلیات کے متعلق ائمہ تفسیر کا نقطہ نظر یہ ہے کہ جن روایات کی تصدیق قرآن وحدیث سے ہو ان کو لیا جائے اور جو اسلامی فکر ونظر کے خلاف ہوں روایت درایت کے اصولوں کے خلاف ہوں تو ان کو رد کیا جائے۔ چنانچہ امام ابن تیمیہ اور حضرت شاہ ولی اللہ کی آراء اس ضمن میں حسب ذیل ہیں:

امام ابن تیمیہؒ (۶۶۱ھ/۱۲۶۳ء-۷۲۸ھ/۱۳۸۲ء) نے اسرائیلی روایت کی تین قسمیں قرار دیں ہیں:

۱۔ ایک وہ جس کی صحت قرآن وسنت سے معلوم ہو چکی ہو۔ اس لیے ہم اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

۲۔ دوسری وہ جس کا جھوٹا ہونا واضح ہو چکا ہو۔ اس لیے ہم اس کے باطل ہونے کے قائل ہیں۔

۳۔ تیسری وہ روایات جن کے بارے میں ہماری ہدایت خاموش ہے۔ ان کی نہ تو ہم تصدیق کرتے ہیں اور نہ تکذیب۔ ان روایات کو استدلال کے لیے بیان کیا جاتا ہے لیکن ایسی روایات سے دین کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ (مجموع فتاوٰی شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ، ج:۱۳، ص:۳۶۶)

حضرت شاہ ولی اللہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس قول:

"لاتصدقوا ولاتکذبوا" کی وضاحت کرتے لکھتے ہیں:

"ایک تو یہ کہ جب کلام کا مفہوم قرآن وحدیث سے معلوم ہو جائے تو بنی اسرائیل سے نقل نہیں کرنا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ ضروری چیز اپنی حد ضرورت تک ہی محدود رہنی چاہیے اس لیے اقتضاء مفہوم کی مقدار کو ملحوظ رکھتے ہوئے بیان کرنا چاہیے تاکہ اس کی تصدیق قرآنی شہادت سے کر سکیں اور اس سے زیادہ بیان سے زبان کو روکنا چاہیے۔" (الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، ص:۶۲)

تفسیر میں اسرائیلیات کا اثر ونفوذ اس کے اثرات اور ان پر نقد وتبصرہ بہت ہی اہمیت کا حامل موضوع ہے۔ اس پر بہت کم کام ہوا۔ عربی واردو میں دو تین کتب ہی منظر عام پر آئیں ہیں۔ عربی میں ڈاکٹر محمد حسین زھبی کی "اسرائیلیات فی التفسیر والحدیث" اور ابوشھبہ کی "الاسرائیلیات والموضوعات فی کتب التفسیر" جبکہ اردو میں مولانا اسیر ادروی کی "تفسیر میں اسرائیلیات" قابل ذکر ہیں۔

زیر نظر کتاب کے فاضل مؤلف جناب پروفیسر ڈاکٹر محمد ہمایوں عباس شمس نوجوان محقق ہیں اور ان کی علمی وتحقیقی مطالعات میں دلچسپی کے خاص موضوعات ہیں: قرآن حکیم، حدیث وسیرت، تذکرہ وسوانح، دعوت وتحریکات شامل ہیں اور وہ ان موضوعات پر اپنی گراں قدر علمی وتحقیقی نگارشات معاصر رسائل وجرائد میں شائع کرتے رہتے ہیں۔ زیر نظر کتاب "کتب تفاسیر میں اسرائیلی روایات" (تحقیقی وتنقیدی جائزہ) میں آپ نے ایک منفرد اسلوب سے اس موضوع

کامطالعہ کیا ہے۔ تفسیر میں مشہور اسرائیلی روایات کا پہلے متن نقل کیا ہے پھر قدیم مفسرین کی اس بارے میں آراء بیان کی ہیں اور معاصر مفسرین کا ان روایات پر نقد وتبصرہ سپرد قلم کیا ہے۔ اس طرح پورے تفسیری سرمایہ میں ان روایات پر جو آراء آئیں ہیں ان کو نقل کرنے کے بعد اپنی آراء بیان کی ہیں۔ بلاشبہ یہ ایک گرانقدر علمی کام ہے جو علوم القرآن وتفسیر اور حدیث سے دلچسپی رکھنے والے محققین اور طلبہ کے لیے مفید ہے۔ فاضل مؤلف نے بڑی عرق ریزی سے ان تمام اسرائیلی روایت پر بنیادی معلومات جمع کر دیں ہیں۔ اس علمی وتحقیقی کام پر وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اسی طرح علوم اسلامیہ میں اپنی تخلیقات وتحقیقات پیش کرتے رہیں۔ آمین

حافظ محمد سجاد

اسرائیلیات (مفہوم)

بائبل میں لفظ اسرائیل مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

ا۔ اسحاق کے بیٹے یعقوب کیلئے

ب۔ اسکی اولاد یعنی عبرانیوں کے بارہ قبیلوں کیلئے

ج۔ شمال کے دس قبیلوں کے لئے جن میں افرائیم پیش پیش تھا۔(۱)

اسرائیلیات کا لفظ اسرائیل سے بنا ہے اس کا اطلاق یہودی منقولات پر ہوتا ہے یا اس سے مراد یہودی ثقافت کی وہ گہری چھاپ ہے جو قرآن کی بعض آیات کی تفسیر پر لگی ہوئی ہے لیکن اسرائیلیات میں ہم وسیع مفہوم پیدا کر کے اس میں نصرانی ثقافت کو بھی شامل کر رہے ہیں لہٰذا جب یہ کہا جائے گا کہ اسرائیلیات سے یہودی و نصرانی دونوں ثقافتوں کی چھاپ مراد ہے تو اسرائیل محض تغلیباً کہا جائے گا۔ یہودی ثقافت کا تمام تر دارومدار تورات پر تھا۔ یہودی تورات کا اطلاق اپنی تمام مقدس کتابوں پر کرتے ہیں جن میں زبور بھی شامل ہے۔ تورات کو جو کہ اسفار موسیٰ علیہ السلام ہیں عہد نامہ قدیم کہا جاتا ہے۔ تورات کے علاوہ یہودیوں کے ہاں کچھ سنن، نصائح اور شروح بھی تھے جن کو اگرچہ خود موسیٰ علیہ السلام نے تو نہیں لکھوایا تھا البتہ ان کے پیروکار اُن سے بطریقِ مشافہہ نقل کرنے کے دعوے دار تھے وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ان اسفار، نصائح اور شروح میں اضافہ ہوتا گیا۔ بعد میں جب ان کو مدون کیا گیا تو ان کا نام تلمود رکھا گیا۔ نصرانیوں کی ثقافت کا دارومدار انجیل پر تھا۔ عیسائیوں کی جو معتبر انجیلیں تھیں اور جن کے ساتھ رسولوں کے کچھ صحائف، خطوط اور مکاشفات شامل تھے ان کو عہد نامہ جدید کہا جاتا ہے۔

---

(۱) قاموس الکتاب ص: ۴۸

اگر ہم تورات وانجیل کا مطالعہ کریں تو حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ دونوں کتابیں ایسے عقائد واعمال اوراحکام پر مشتمل ہیں جن میں قرآن بھی ان کا ساتھ دیتا ہے خاص کرانبیاء کی تاریخ میں خاصی مشابہت پائی جاتی ہےاور قرآن ان کی تصدیق بھی کرتا ہے۔لیکن اس مشابہت میں ایک فرق بین ہے کہ تورات وانجیل میں بے انتہا اور بے مقصد تفصیل ہے واقعات میں ہر قسم کا غث وسمین موجود ہے مگر قرآن کسی واقعہ کا وہی حصہ بیان کرتا ہے جوانسانیت کیلئے باعث عبرت وموعظت ہوتا ہے۔احکام میں وہ ایک کلیہ یا بنیادی مسئلہ فراہم کردیتا ہے جزئیات وتفاصیل میں نہیں پڑتا یایوں کہنا چاہیے کہ وہ کسی واقعے کا لب لباب پیش کرکے آگے بڑھ جاتا ہے۔[۲]

اسرائیلیات کی اقسام:

(ا) صحت وعدم صحت کی بنیاد پر اقسام:

صحت وعدم صحت کی بنیاد پر اسرائیلات کی تین اقسام ہیں:

i۔ صحیح (مثال: سورۃ الاعراف آیت ۱۵۷ کے تحت دیکھئے تفسیر ابن کثیر)

ii۔ ضعیف (مثال: سورۃ ق کے شروع میں ایک روایت نقل کرکے ابن کثیر لکھتے ہیں: **فاسناد هذا الاثر فيه انقطاع**)

iii۔ موضوع

(ب) ہماری شریعت کی مخالفت وموافقت کے اعتبار سے اقسام:

کسی اسرائیلی روایت کی ہماری شریعت کے موافق یا مخالف ہونے کے اعتبار سے تین اقسام ہیں:

---

(۲) غزل کاشمیری کے مضمون سے اقتباس

i۔ ہماری شریعت کے موافق

ii۔ ہماری شریعت کے مخالف

iii۔ شریعت محمدی کا سکوت

(ج) اسرائیلی روایات کی موضوعاتی تقسیم:

موضوع کے اعتبار سے اسرائیلی روایات کی درج ذیل تین اقسام ہیں

i۔ عقائد سے متعلقہ اسرائیلی روایات

ii۔ احکام سے متعلقہ اسرائیلی روایات

iii۔ حوادث زمانہ یا وعظ و نصیحت سے متعلقہ اسرائیلی روایات

تمام اسرائیلی روایات اپنی زہرناکی کے لحاظ سے یکساں نہیں۔ ان میں سے جو عقائد کے متعلق نہیں ہیں بلکہ بعض مجمل آیات کی تشریح یا بعض واقعات کی تفصیل بیان کرتی ہیں انہیں ان روایات کے برابر نہیں قرار دیا جاسکتا جو عقائد سے متعلق ہیں۔ اور جن کے وضع کرنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ عقائد اور شریعت اسلامیہ کی عمارت کو زمین بوس کر دیا جائے۔

تفسیر اور اسرائیلی روایات:

تفسیر میں اسرائیلیات کی ابتدا عہد صحابہ سے ہوئی۔ اکثر دفعہ ایسا ہوتا کہ کوئی صحابی قرآنی قصہ پڑھتے تو اسکی مزید توضیح وتشریح کیلئے اہل کتاب سے پوچھ لیتے۔ لیکن صحابہ ہر چیز کا سوال اہل کتاب سے نہ کرتے ان کا سوال اکثر و بیشتر اس واقعہ کی تفصیل سے متعلق ہوتا جسے قرآن نے مختصراً بیان کیا۔ عقائد و احکام کے بارہ میں بھی صحابہ اہل کتاب سے استفسار نہ کرتے۔ ایسے سوالات سے بھی احتراز کرتے جو قصہ یا کہانیوں کی لایعنی تفاصیل کے متعلق ہوتے مثلاً

اصحاب کہف کتنے تھے؟ ان کے کتے کا رنگ کیسا تھا؟ کشتی نوح کا طول وعرض کیا تھا؟ خضر علیہ السلام نے جس لڑکے کو قتل کیا اسکا نام کیا تھا؟ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں کہ: ''صحابہ اس قسم کے فضول تکلفات کو قبیح اور وقت کا ضیاع خیال کرتے تھے۔''[۳]

صحابہ کا طرز عمل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے عین مطابق تھا:

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اہل کتاب تورات کو عبرانی زبان میں پڑھتے تھے اور اہل اسلام کیلئے اسکی تفسیر عربی میں کرتے تھے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہل کتاب کی تصدیق کرو نہ تکذیب کرو بلکہ کہو ہم اللہ پر ایمان لائے اور جو کچھ ہم پر اتارا گیا اس پر ایمان لائے۔''[۴]

صحابہ کا یہ عالم تھا کہ جب وہ اہل کتاب سے کوئی سوال کرتے اور وہ غلط جواب دیتے تو اس کو رد کر دیتے اور ان کی غلطی کو ان پر واضح کرتے۔ صحیح بخاری کی کتاب الجمعۃ کی روایت کے مطابق یوم جمعہ میں ایک ساعت ایسی ہے کہ اس میں جو مانگا جائے وہ مل جاتا ہے۔ اس گھڑی کے تعین اور اس بات میں کہ آیا یہ باقی ہے یا اُٹھ گئی ہے، اگر باقی ہے تو آیا ہر جمعہ میں ہوتی ہے یا سال بھر میں صرف ایک جمعہ؟ حضرت ابو ہریرہ نے اس گھڑی کے بارہ میں کعب الاحبار سے پوچھا، انہوں نے کہا کہ یہ گھڑی دوران سال صرف ایک بار ہوتی ہے حضرت ابو ہریرہ نے اسکی تردید کرتے ہوئے کہا کہ یہ ہر جمعہ ہوتی ہے۔ چنانچہ کعب الاحبار نے دوبارہ تورات کا مطالعہ کیا تو ابو ہریرہ کی بات کو سچ پایا۔[۵]

---

(۳) الفوز الکبیر

(۴) صحیح بخاری کتاب التفسیر باب قولہ تعالیٰ امنا باللہ وما انزل الینا

(۵) ارشاد الساری للقسطلانی، جلد ۲، ص: ۱۹۰

اس واقعہ سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ صحابہ ہر بات بلا چون وچرا قبول نہ کرتے تھے اگر کوئی بات صحیح نہ سمجھتے تو رد کردیتے ہے اور روایت اخذ کرنے میں اس دائرہ سے نہ نکلتے جو نبی کریم ﷺ نے بیان فرمایا: "بلّغوا عنّی ولو آیة وحدّثوا عن بنی اسرائیل ولا حرج ومن کذب علیّ متعمّدا فلیتبوّأ مقعدهٗ من النّار." ؎٦

"یعنی میری طرف سے لوگوں تک احکام پہنچاؤ چاہے ایک آیت ہی کیوں نہ ہو اور بنی اسرائیل سے روایت کرو اس میں کوئی حرج نہیں اور جس نے مجھ پر قصداً جھوٹ باندھا وہ اپنا ٹھکانہ جہنم بنالے۔"

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "یہ امر محتاج بیان نہیں کہ نبی کریم ﷺ جھوٹی روایات بیان کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے اس لئے اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جس بات کے جھوٹا ہونے کا تمہیں علم نہ ہو بنی اسرائیل کے بارہ وہ بیان کیجئے کیوں کہ سچی بات کی نقل وروایت میں کچھ مضائقہ نہیں۔"

دوسری حدیث بھی اسکی مانند ہے جس میں آپ نے فرمایا:

"اہل کتاب کی تصدیق کیجئے نہ تکذیب"

جو بات سچی اور قطعی ہو اسکی روایت کرنے سے آپ نے منع نہیں فرمایا۔ ؎٧

اسرائیلیات اور معروف رواۃ:

اسرائیلی روایات عموماً درج ذیل صحابہ، تابعین یا تبع تابعین سے مروی ہیں:

---

(٦) الصحیح للبخاری- کتاب الانبیاء باب ماذکر عن بنی اسرائیل

(٧) فتح الباری جلد ٦، ص ٣٢٠

(ا) صحابہ

۱۔ حضرت ابوہریرہ ۲۔ عبداللہ بن عباس

۳۔ عبداللہ بن عمرو بن العاص ۴۔ عبداللہ بن سلام

۵۔ تمیم داری

(ب) تابعین

۱۔ کعب الاحبار ۲۔ وھب بن منبہ

(ج) تبع تابعین

۱۔ محمد بن السائب الکلبی ۲۔ عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریج

۳۔ مقاتل بن سلیمان ۴۔ محمد بن مروان السدی [8]

کتب تفاسیر اور اسرائیلی روایات:

ہر مفسر نے اپنا ایک جداگانہ تفسیری منہج اختیار کیا۔ اسرائیلی روایات کے نقل کرنے میں بھی مفسرین نے مختلف اسلوب اختیار کیے۔ اس اعتبار سے کتب تفسیر کو مختلف انواع میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ مفسر ہر روایت کو سند کے ساتھ نقل کر دیتے ہیں اور کوئی نقد نہیں کرتے اس ضمن میں معروف ترین تفسیر محمد بن جریر بن یزید طبری (م ۳۱۰ھ) کی جامع البیان فی تفسیر القرآن ہے۔ امام طبری نے اسناد کا اہتمام کے ساتھ ذکر کیا لیکن ان کی جانچ پڑتال قاری پر چھوڑ دی وہ اپنی تفسیر میں سند کے ساتھ کعب الاحبار، وھب بن منبہ، ابن جریج اور سدی سے بکثرت اسرائیلی واقعات

(۸) اسرائیلیات فی التفسیر والحدیث، دکتور محمد حسین الذھبی ص: ۹۳

نقل کرتے ہیں۔ آپ محمد بن اسحاق کے نومسلم نصاری سے سنے ہوئے واقعات بھی روایت کرتے ہیں۔ بعض اوقات امام طبری ایک ناقد کی حیثیت سے روایات کا جائزہ بھی لیتے ہیں جیسے سورۃ الکھف کی آیت ۹۴:

((قالوا یاذالقرنین انّ یاجوج وماجوج......ان تجعل بیننا وبینھم سدّا)) کے تحت ایک روایت کی سند اسی طرح درج کی: حدّثنا بہ احمد بن یوسف قال: حدّثنا القاسم، قال: حدّثنا حجاج، عن ھارون، عن ایوب، عن عکرمۃ قال: کہ عکرمہ کہتے ہیں: ''انسان کی تعمیر کردہ دیوار کو سَدّ بفتح السین اور جو اللہ تعالیٰ کی بنائی ہو اسکو سُدّ بضمّ السین کہا جاتا ہے۔''

اس روایت پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں: وأما ماذکر عن عکرمۃ فی ذلک فان الذی نقل ذلک عن ایوب ھارون وفي نقلۃ نظر، ولا یعرف ذلک عن ایوب مٖن روایۃ ثقات اصحابہ۔[9]

ہارون نے ایوب سے روایت کی اور ایوب نے عکرمہ سے اور ہارون کی ایوب سے روایت محل نظر ہے، ایوب کے قابل اعتماد تلامذہ سے کسی نے بھی یہ روایت نہیں کی۔

۲۔ بعض مفسرین نے اسرائیلی روایات مع سند نقل کی ہیں اور ان پر جرح بھی کی۔ تفسیر القرآن العظیم[10] المحرر الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز[11] اسکی مثالیں ہیں۔ ابوحیان اندلسی[12] کی البحر المحیط کو بھی اسی زمرہ میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

---

(۹) جامع البیان جلد ۱۶، ص: ۱۳

(۱۰) حافظ عماد الدین ابو الفداء اسماعیل بن عمرو بن کثیر متوفی ۷۷۴ھ

(۱۱) ابومحمد عبدالحق بن غالب بن عطیہ اندلسی (۱۲) متوفی ۶۵۴

۳۔ کچھ مفسرین نے بلاسند اسرائیلی روایات کونقل کیا اوران پر کوئی تنقید بھی نہیں کی جیسے مقاتل بن سلیمان۔۱۳ کی تفسیر اور الکشف والبیان عن تفسیر القرآن از ثعلبی ۱۴۔

۴۔ تفسیر کی بعض کتب میں اسناد کا التزام تو نہیں کیا لیکن اسرائیلی روایات کونقل صرف اس لئے کیا کہ ان کارد کیا جا سکے۔ جیسے سید محمود آفندی آلوسی بغدادی ۱۵ کی تفسیر روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی۔

۵۔ تفسیر المنار از سید محمد رشید رضا۔۱۶ کا شمار ایسی تفاسیر میں ہوتا ہے جنہوں نے شدت سے اسرائیلیات کارد کیا اور اس کیلئے قرون اولیٰ کے اصحاب پر تنقید سے بھی گریز نہیں کیا۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کا اسرائیلیات کے بارہ میں موقف:

عبدالسلام ندوی اسرائیلیات کے بارہ میں امام رازی کے مؤقف کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''نقلی حیثیت سے اسرائیلیات کا جوحصہ قابل تنقید تھا ان کا تعلق زیادہ تر ان قصوں سے تھا جو قرآن مجید میں مذکور ہیں۔ ان روایتوں میں بعض باتیں تو غیر ضروری، مبالغہ آمیز بلکہ بعض صورتوں میں بالکل عقل کے مخالف ہیں اور بعض باتوں سے انبیاء علیہم السلام کی ذات پر سخت اخلاقی اعتراضات وارد ہوتے ہیں لیکن کتبِ کلامیہ میں ان کا ذکر اس لحاظ سے نہیں کیا جاتا کہ متکلمین کے نزدیک قرآن مجید کے اس حصہ سے بحث کرنا محدث اور مفسر کا منصب ہے حالانکہ ان اعتراضات کا جواب علمِ کلام کا ایک نہایت ضروری جزء تھا۔''

اس بنا پر سب سے پہلے معتزلہ نے ان روایتوں سے انکار کیا۔ ان کے بعد امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے ان روایتوں پر تنقید کی اور نہایت قوی دلیلوں سے ثابت کیا کہ یہ روایتیں سرتاپا غلط ہیں۔

---

(۱۳) متوفی ۱۵۰ (۱۴) متوفی ۴۲۷ھ (۱۵) متوفی ۱۲۷۰ھ (۱۶) متوفی ۱۳۵۴ھ

پہلی صورت میں امام صاحب نے ان تمام اسرائیلی روایتوں کواس اصول کی بناء پر رد کر دیا کہ قرآن مجید میں جو قصے مذکور ہیں وہ تاریخی حیثیت سے مذکور نہیں بلکہ ان کا مقصد محض پند موعظت یا حصولِ عبرت ہے۔اس لیے ان کی تمام تاریخی خصوصیات کا نمایاں کرنا غیر ضروری ہے۔چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام کو جنت میں جس درخت کے پھل کھانے سے منع کیا گیا تھا اس کی تعیین میں اسرائیلی روایتیں مختلف ہیں۔بعض لوگوں کے نزدیک وہ گیہوں کا، بعض لوگوں کے نزدیک انگور کا اور بعض لوگوں کے نزدیک انجیر کا درخت تھا۔لیکن امام صاحب ان تمام روایتوں کو نقل کر کے لکھتے ہیں کہ قرآن مجید کے ظاہر الفاظ سے اس درخت کی تعیین نہیں ہوتی۔اس لیے ہم کو بھی اس تعیین کی ضرورت نہیں کیونکہ اس قصہ کا یہ مقصد نہیں ہے کہ ہم کو متعین طور پر اس درخت کا علم ہو اور جو چیز کلام کا اصل مقصود نہیں ہوتی اس کی توضیح بعض اوقات غیر ضروری ہوتی ہے۔ مثلاً اگر ایک شخص کو آنے میں دیر ہو جائے اور وہ اس کی یہ معذرت کرے کہ مجھ کو اپنے غلاموں کی تادیب میں دیر ہوگئی تو اس کے لیے ان غلاموں کے نام اور اوصاف کا ذکر کرنا غیر ضروری ہے۔ اس کے لیے بہتر یہی ہے کہ صرف اسی قدر کلام پر اکتفا کرے اس لیے کوئی شخص یہ گمان نہیں کر سکتا کہ اس نے توضیح بیان میں کوتاہی کی ہے"۔ ۱۷

قرآن مجید میں حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کا جو ذکر آیا ہے اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس کشتی کے اوصاف کے متعلق بہت سے اقوال مذکور ہیں۔ایک تو یہ کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اس کشتی کو دو یا چار سال میں بنایا تھا اور اس کا طول تین سو گز اور عرض پچاس گز اور بلندی ۳۰ گز کی تھی۔ساکھو کی لکڑی سے بنائی گئی تھی اور اس میں تین درجے تھے۔نیچے کا درجہ کیڑوں مکوڑوں کے لیے، بیچ کا درجہ چارپایوں کے لیے اور اوپر کا درجہ خود ان کے اور اُن کی قوم اور ان کے زادِ راہ کے

(۱۷) تفسیر کبیر جلد ا ص ۴۵۶-۴۵۷

لیے مخصوص تھا۔ دوسرے یہ کہ اس کا طول بارہ سو گز اور عرض چھ سو گز کا تھا۔

امام صاحب ان روایتوں کے نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ اس قسم کی بحثیں مجھے اچھی نہیں معلوم ہوتیں کیونکہ ان کا علم غیر ضروری ہے اور اس سے کوئی فائدہ نہیں اور ان میں غور و فکر کرنا فضول ہے۔ بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ ہم کو یقین ہے کہ اس جگہ کوئی ایسی دلیل نہیں جو صحیح جانب دلالت کرے۔ ہم کو جو کچھ معلوم ہے وہ یہ ہے کہ اس کشتی میں اس قدر وسعت تھی کہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم اپنے زادِ راہ کے ساتھ اس میں بیٹھ سکتی تھی اور ہر حیوان کے جوڑے اس میں آسکتے تھے۔ قرآن مجید میں صرف اسی قدر مذکور ہے۔ اس کے سوا اور کچھ مذکور نہیں۔ ۱۸ لیکن امام صاحب ان اقوال کو نقل کر کے لکھتے ہیں کہ ان میں کسی قول کو کسی قول پر ترجیح نہیں دی جاسکتی کیونکہ قرآن مجید سے ان کے ترجیحی وجوہ نہیں معلوم ہوتے اور یہ اقوال خود باہم ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ ۱۹

غرض اس قسم کے تمام موقعوں پر امام صاحب صرف قرآن مجید کے الفاظ کو پیشِ نظر رکھتے ہیں اور مفسرین کی غیر ضروری تفصیلات اور غیر ضروری احتمالات کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مثلاً خداوند تعالیٰ نے بنو اسرائیل کو حکم دیا تھا کہ گائے کو ذبح کر کے اس کے کسی ٹکڑے کو مقتول پر مارو تو وہ زندہ ہو جائے گا۔ لیکن قرآن مجید نے اس ٹکڑے کی تعیین نہیں کی ہے۔ اس لیے اس کی تعیین میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ اس سے زبان، کوئی کہتا ہے داہنی ران، کوئی کہتا ہے دُم اور کوئی کہتا ہے کہ ہڈی مراد ہے۔

لیکن امام صاحب کہتے ہیں کہ قرآن مجید ان میں سے کسی کی تعیین پر دلالت نہیں کرتا۔

---

(۱۸) تفسیر کبیر جلد ۵ ص ۸۳

(۱۹) تفسیر کبیر جلد ۶ صفحہ ۶۰۴

اس لیے اگر اس کے متعلق کوئی صحیح حدیث موجود ہو تو اس کو قبول کر لینا چاہیئے ورنہ خاموشی اختیار کرنی چاہیئے۔[20]

دوسری صورت میں امام صاحب نے ان تمام روایتوں سے انکار کیا جن سے پیغمبروں یا فرشتوں کی عصمت پر اعتراض ہوتا تھا۔ مثلاً قرآن مجید میں ہاروت و ماروت کا قصہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

وَاتَّبَعُوْا مَاتَتْلُوْا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ. وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ وَمَا اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ. وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَا اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ. فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَايُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ. [21]

اور (اُن ڈھکوسلوں کے) پیچھے پڑ گئے جن کو سلیمان کے عہد سلطنت میں شیاطین پڑھا (پڑھایا) کرتے تھے حالانکہ سلیمان سے کفر کی (یہ) حرکت سرزد نہیں ہوئی بلکہ کفر کیا تھا تو شیاطین نے کیا تھا۔ لوگوں کو جادو سکھایا کرتے تھے اور (اس کے علاوہ ان باتوں میں مشغول ہو گئے) جو بابل میں ہاروت و ماروت فرشتوں کو پہنچائی گئی تھیں اور وہ (فرشتے بھی جو ان کو پہنچا تھا) کسی کو نہ بتاتے جب تک اس سے یہ نہ کہہ دیتے کہ ہم تو (ذریعہ) آزمائش ہیں تو (اس علم کو بُری طرح استعمال کر کے) کہیں تو کافر نہ ہو جائیو اس پر بھی ان سے ایسی باتیں سیکھتے جن کی وجہ سے میاں بی بی میں جدائی ڈال دیں۔

اس قصہ کے بارہ میں جو کہانی بیان کی جاتی ہے امام رازی نے اس کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد اسکار د کر دیا۔ (جلد اول ص:۶۴۹-۶۵۳)

---

(۲۰) تفسیر کبیر جلد ا ص ۵۶۷ (۲۱) البقرہ:۱۰۲

غرض قرآن مجید میں انبیاء علیہم السلام کے جو قصے مذکور ہیں ان کے متعلق جن اسرائیلیات سے ان کی عصمت پر حرف آتا ہے ان کی تردید امام صاحب نہایت زور شور سے کرتے ہیں لیکن بعض قصے ایسے ہیں جن سے انبیاء کی عصمت پر تو حرف نہیں آتا تاہم وہ نہایت دور از کار اور انبیاء کی شان کے خلاف ہیں لیکن امام صاحب اس زور شور سے ان کی تردید نہیں کرتے۔

علامہ یوسف القرضاوی کی اسرائیلیات کے بارہ میں رائے:

ہمارے تفسیری ثقافتی ورثے کو جس چیز نے سب سے زیادہ داغدار کیا ہے وہ اس میں اسرائیلیات کا نفوذ ہے۔ جس نے اس چشمہ صافی کو بہت کچھ گدلا کر کے رکھ دیا۔

تفسیری سرمائے میں اسرائیلیات کے نفوذ اور اس کی آمیزش کا آغاز تو ابتداء اسلام یعنی صحابہ و تابعین کے زمانے ہی سے ہو چکا تھا جس میں زیادہ بڑا کردار کعب احبار اور وہب بن منبہ جیسے لوگوں کا رہا جو اہل کتاب میں سے حلقہ بگوش اسلام ہوئے تھے۔ دوسرے مسلمانوں نے بھی یہود و نصاریٰ کی کتابوں سے متاثر ہو کر اس طرح کی بہت چیزیں اپنے یہاں شامل کر لیں۔

شروع شروع میں تو یہ آمیزش اور یہ نفوذ کم تھا بعد میں بڑھتا گیا اس کا دائرہ تنگ تھا پھر وسیع ہوتا گیا۔ اپنے آغاز میں تو یہ چیز سادہ نوعیت کی تھی لیکن آگے اس نے مکروفریب اور حیلہ سازیوں کا نیا رنگ اختیار کر لیا اور پھر ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت دسیسہ کاریوں کا بازار گرم ہو گیا۔

ایسا لگتا ہے کہ جب یہودیت، مدینہ و خیبر وغیرہ میں دعوت اسلام کے سامنے محاذ جنگ پر شکست کھا گئی تو اسلام سے اس نے اپنی اس شکست کا بدلہ ایک دوسری صورت سے لینا چاہا۔ یہ صورت تھی مسلمانوں کو فکری اور تہذیبی اعتبار سے شکست دینے کی جس کے لیے اس نے مسلمانوں کی غفلت کا فائدہ اٹھا کر ان کے درمیان اسرائیلی روایات کو پوری تیزی کے ساتھ رواج

دینا شروع کیا۔ نتیجہ ہوا کہ زیادہ وقت نہیں گذرنے پایا کہ اسلامی لٹریچر کا کافی بڑا ذخیرہ بے سروپا اسرائیلیات کے طومار سے بھر گیا۔

حالانکہ قرآن نے اہل کتاب اور خاص طور پر یہود کے سلسلے میں صاف لفظوں میں خبردار کر دیا تھا کہ اپنی تحریفات کے ذریعہ انہوں نے اپنی کتابوں کے چہروں کو مسخ کر ڈالا ہے اور اپنی نادانی سے اللہ کی ذات پر نہ جانے کیا کیا اتہامات باندھتے رہے ہیں۔ قرآن حکیم کی آیات ذیل انہی اہل کتاب کے بارے میں ہیں:

يَسْمَعُونَ كَلامَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ مِنْ بَعْدِ مَاعَقَلُوهُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ. ۲۲

وہ اللہ کے کلام کو سنتے ہیں پھر اسے کچھ کا کچھ بدل ڈالتے ہیں بعد ازاں کہ وہ اسے خوب سمجھ چکے ہوتے ہیں اور (یہ کام) وہ خوب جانتے بوجھتے کرتے ہیں۔ نیز

وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لايَعْلَمُوْنَ الْكِتَابَ اِلاَّ اَمَانِيَّ. ۲۳

اور ان میں کچھ ان پڑھ ہیں جن کو کتاب (یعنی توراۃ) کی کچھ خبر نہیں سوائے اس کے کہ وہ اسے اپنی آرزوں کی تکمیل کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

اسی طرح فرمایا: يَكْتُبُوْنَ الْكِتَابَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذامِنْ عِنْدَ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَناً قَلِيْلاً. ۲۴

وہ کتاب کو لکھتے تو اپنے ہاتھ سے ہیں پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ اس سے تھوڑا نفع کمائیں۔ مزید برآں

وَنَسُوْا حَظّاً مِمَّا ذُكِّرُوْابِهٖ. ۲۵

وہ بھلا بیٹھے ایک بڑا حصہ اس (کتاب) کا جس کے ذریعہ انہیں نصیحت کی گئی تھی۔

---

(۲۲) بقرہ-۷۵ (۲۳) بقرہ-۷۸ (۲۴) بقرہ-۷۹ (۲۵) مائدہ-۱۳

نیز

یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِہٖ.٢٦

وہ کلام (الٰہی) کو ہٹاتے ہیں اس کی اصل جگہوں سے۔

ان کے علاوہ بے شمار آیات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے انہی صفات بد کی وجہ سے ان کی سرزنش کی ہے۔

شاید یہی وجہ تھی جو رسول اللہ ﷺ حضرت عمر کے ہاتھ میں تورات کا نسخہ دیکھ کر غضبناک ہو گئے تھے اور فرمایا تھا:

اَوَمُتَھَوِّکُوْنَ فِیْھَا یَاابْنَ الْخَطَّابِ لَقَدْ جِئْتُکُمْ بِھَا بَیْضَآءَ نَقِیَّۃً وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَوْکَانَ مُوْسٰی حَیًّا مَّاحَلَّ لَہٗ اِلَّا اَنْ یَّتَّبِعَنِیْ.٢٧

اے ابن خطاب! کیا (یہود و نصاریٰ کی طرح) تم بھی شریعت کے معاملہ میں حیرانی کا شکار ہونا چاہتے ہو۔ میں اسے تمہارے پاس انتہائی صاف ستھری شریعت لے کر آیا ہوں۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے (اگر آج) موسیٰ بھی زندہ ہوتے تو انہیں بجز میری پیروی کے دوسری بات روا نہ ہوتی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا اور رسول ﷺ کی ان واضح تنبیہات کے باوجود کس طرح مسلمانوں نے اہل کتاب اور خاص طور پر یہودیوں کی روایات کو قبول کرنے میں سہل نگاری سے کام لیا۔ میرے خیال میں دو وجہوں سے اس سہل نگاری کو روا رکھا گیا۔

---

(٢٦) نساء-٤٦

(٢٧) مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الایمان، باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، الفاظ میں اختلاف ہے۔ (مترجم)

پہلی غلط فہمی تو ان کو بخاری کی اس روایت کے ظاہری الفاظ سے ہوئی جسے حضرت عبداللہ بن عمرو نے مرفوعاً بایں الفاظ نقل کیا ہے:

بَلِّغُوا عَنِّی وَلَوْ آیَةً وَحَدِّثُوا عَنْ بَنِی اِسْرائیلَ وَلاحَرَجَ وَمَنْ کَذَبَ عَلَیَّ مُتَعَمِّداً فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ.

مجھ سے لوگوں تک پہنچاؤ خواہ وہ ایک آیت ہی کیوں نہ ہو اور بنی اسرائیل سے چیزیں بیان کرو اس میں حرج نہیں البتہ جو کوئی مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ باندھے تو وہ جہنم میں اپنا ٹھکانہ بنالے۔

چنانچہ حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر کے مقدمہ میں اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ جن چیزوں کا ہمارے دین کی رو سے جھوٹا ہونا ثابت نہ ہو ان کے سلسلے میں اہل کتاب سے روایت کی جاسکتی ہے۔ دوسری وجہ یہ لوگ ان اسرائیلیات کو بے تکلف اپنی تفسیروں میں نقل کرتے رہے وہ غالباً یہ رہی کہ ان چیزوں کے بارے میں پہلے سے کچھ پتہ نہ تھا۔ مسلمانوں کے پاس قران وسنت کا اپنا جو ذخیرہ تھا اس کی رو سے نہ تو وہ ان کے صحیح ہونے کا فیصلہ کرسکتے تھے نہ پورے وثوق سے انہیں جھوٹا ہی قرار دے سکتے تھے۔ اس لئے کہ ان میں انہیں خلاف واقعہ قرار دینے والی کوئی چیز صریح موجود نہ تھی۔ پس یہ وہ چیزیں تھیں کہ نہ تو ان کی صحت کا فیصلہ کیا جاسکتا تھا نہ انہیں جھوٹا ہی قرار دیا جاسکتا تھا۔ اسی احتمال کی بناء پر انہیں نقل کرنے میں چنداں قباحت محسوس نہیں کی گئی۔ اگرچہ دین کے سلسلے میں ان کا کوئی فائدہ بھی دکھائی دیتا نظر نہ آتا تھا۔

حافظ ابن کثیر اپنے مقدمہ تفسیر میں علامہ ابن تیمیہ کے رسالہ تفسیر کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں:

''یہی وجہ ہے جو اہل کتاب اس طرح کی چیزوں میں بہت زیادہ اختلاف کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ اصحاب کہف کے ناموں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ نیز یہ کہ ان کے کتے کا کیا رنگ تھا، ان کی تعداد کیا تھی، اسی طرح مثال کے طور پر یہ بات کہ موسیٰ علیہ السلام کا عصا کس درخت کی لکڑی کا تھا؟ ان چڑیوں کے نام کیا تھے جنھیں حضرت ابراہیم نے زندہ کیا تھا؟ بنی اسرائیل کے اس مردے کو گائے کے جس ''بعض'' سے مارا گیا تھا تو اس ''بعض'' سے کیا مراد ہے؟ اسی طرح وہ درخت کس چیز کا تھا جس کے اوٹ سے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا تھا وغیرہ وغیرہ۔ بہت سی چیزیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے قرآن میں مجمل رکھا ہے۔ اس لیے کہ نام لے کر اگر ان چیزوں کو بتا بھی دیا جاتا تو مخاطب کے لئے نہ تو دنیا کے لحاظ سے اس کا کوئی فائدہ تھا نہ آخرت کے لحاظ سے لیکن اس کے باوجود ان چیزوں کے باب میں اہل کتاب کے ذکر کردہ اختلافات کا بیان کرنا جائز ہے جیسا کہ اصحاب کہف کے بیان کے ذیل میں قرآن حکیم کی اس آیت سے واضح ہے:

سَیَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ.[۲۸]

ان (اہل کتاب) میں کچھ کہیں گے وہ (اصحاب کہف) تین تھے اور چوتھا ان کا کتا............الخ

البتہ علامہ احمد شاکرؒ نے ابن کثیرؒ کے اس خیال پر گرفت کی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے بہت خوب بات کہی ہے فرماتے ہیں:

''اہل کتاب سے ان چیزوں کو روایت کرنا جن کو پرکھنے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ آیا وہ صحیح ہیں یا غلط یہ چیز اپنی جگہ لیکن ان کا ذکر قرآن کی تفسیر میں کرنا اور ان کو آیت کی تفسیر

---

(۲۸) کہف-۲۲

کے ذیل میں ایک قول یا روایت کی حیثیت سے پیش کرنا یا ان کی بنیاد پر نامعلوم چیزوں کا تعین کرنا یا وہ باتیں جو اجمالاً بیان ہوئی ہیں ان کے ذریعہ ان کی تفصیل کرنا یہ بالکل دوسری چیز ہے۔ کلام اللہ کے پہلو بہ پہلو ان چیزوں کو نقل کرنے سے بجا طور پر یہ اشتباہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی یہی شرح ہے اور یہی اس کے اجمال کو تفصیل کا قالب عطا کر رہی ہے۔ حالانکہ یہ وہ چیز ہے جس کے صحیح یا غلط ہونے کا ہمیں کوئی پتہ نہیں ہے۔ پناہ بخدا کہ اس کی کتاب ان ہفوات سے آلودہ ہو۔

رسول خداﷺ نے ہمیں جو اس بات کی اجازت دی ہے کہ ہم ان کی اس طرح کی چیزوں کو بیان کر سکتے ہیں تو اس کے ساتھ ہی آپﷺ نے ہمیں اس بات کا بھی حکم دیا ہے کہ اگر ہم ان چیزوں کی تکذیب نہ کریں تو ان کی تصدیق بھی نہ کریں۔ اب بھلا ان کی ان روایتوں اور ان اقوال کی اس سے بڑھ کر اور تصدیق کیا ہو سکتی ہے کہ ہم انہیں کتاب اللہ کے پہلو بہ پہلو نقل کریں اور اس طرح یہ تاثر دینے کی کوشش کریں کہ گویا یہی کتاب الٰہی کی تفسیر اور اس کی تشریح ہے؟ اس سے تو ہم خدا کی پناہ ہی طلب کر سکتے ہیں''۔

اسی طرح خود حافظ ابن کثیر نے بھی سورہ کہف کی آیت: ۵۰ کی تفسیر میں ''ابلیس'' کے سلسلے میں مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد کہ اس کا نام کیا ہے اور وہ کس جنس سے ہے اور اس کی کیا خصوصیات ہیں یہی بات کہی ہے۔ فرماتے ہیں:

''اس سلسلے میں سلف سے بہت سے آثار مروی ہیں جن کا تعلق اکثر و بیشتر اسرائیلیات سے ہے۔ جو محض اس لئے نقل کر دی جاتی ہیں تاکہ ان پر غور کیا جا سکے۔ ان کا صحیح حال تو بس خدا کو معلوم ہے۔ البتہ ان میں کچھ چیزیں ایسی ضرور ہیں جن کے جھوٹے ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ اس لئے کہ وہ اس حق کے مخالف ہیں جو قرآن کی صورت ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے۔ زمانہ

ماسبق کے سلسلے میں جو باتیں بھی بیان کی جاتی ہیں قرآن ان سے بالکل بے نیاز ہے۔اس لیے کہ یہ بہت مشکل ہے کہ وہ کمی بیشی اور تبدیلیوں سے پاک ہوں۔ بلکہ ان کے اندر بہت سی بالکل من گھڑت باتوں کا شامل ہونا بھی یقینی ہے۔خاص طور پر اس لئے کہ گذشتہ امتوں کے اندر ایسے قابل اعتماد حفاظ کا کوئی وجود نہ تھا جو ان کے دینی ذخیرے کے سلسلے میں غلو پسندوں کی تحریفات اور باطل پرستوں کی اختراعات کے غبار کو زائل کر سکتے ہیں جیسا کہ ہماری اس امت کا معاملہ ہے کہ یہاں ہر دور میں ایسے ائمہ اعلام موجود رہے ہیں جو اس کے معتمد علیہ مآخذ کے سلسلے میں ایسی ہر امکانی کوشش کے پردے کو چاک کرتے رہے ہیں۔''۲۹

اسی طرح سورۂ ق کی تفسیر کے آغاز میں فرماتے ہیں:

''سلف میں کچھ لوگوں سے مروی ہے کہ ''ق'' ایک پہاڑ کا نام ہے جو پورے کرۂ ارضی کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور اسے ''جبل قاف'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ایسا لگتا ہے کہ یہ بھی بنی اسرائیل کے انہی خرافات میں سے ہے جسے کچھ لوگوں نے ان سے نقل کر کے بیان کر دیا ہے۔یہ سمجھتے ہوئے کہ اس طرح کی خبریں جن کی صحیح یا غلط ہونے کے سلسلے میں قطعی طور پر کوئی بات نہ کہی جا سکے ان کا ان سے روایت کرنا جائز ہے۔میرے نزدیک یہ اور اس طرح کی دوسری چیزیں ان کے بعض زنادقہ کی ایجاد کردہ ہیں جو اپنی ان حرکتوں سے لوگوں کے اوپر ان کے دین کو گڈمڈ کرنا چاہتے تھے جیسا کہ خود ہماری اس امت کے ساتھ معاملہ پیش آیا کہ باوجودیکہ اس میں ہر دور میں بلند پایہ علماء حفاظ حدیث اور ائمہ اعلام کی ایک بڑی تعداد موجود رہی لیکن پھر بھی لوگ نبی ﷺ کی طرف منسوب کر کے من گھڑت حدیثیں بیان کرنے سے باز نہ رہے۔جبکہ ابھی اس پر زیادہ زمانہ بھی گذرنے نہیں پایا تھا پھر بھلا بنی اسرائیل کی روایت کردہ چیزوں کو جوں کا توں کیونکر قبول کیا

---

(۲۹) عمدۃ التفسیر جلد اول، ص:۱۵

جاسکتا ہے۔ جبکہ ان کا زمانی فاصلہ کافی بڑھا ہوا ہے۔ حفاظ اور ناقدین کا وجود ان میں ہمیشہ نہ ہونے کے برابر رہا۔ شراب نوشی ان کے خمیر میں شامل اور ان کے علماء کا یہ عام دستور کہ بات کو اس کے مقام سے ہٹا کر اسے کچھ کا کچھ بنا دیں اور اپنی کتابوں میں لفظی تحریفات کے ارتکاب سے بھی نہ چوکیں۔ اب اگر حضور ﷺ نے "وَحَدِّثُوا عَنْ بَنِی اِسْرائِیلَ وَلاحَرَجَ" فرما کر ان سے روایت کرنے کی اجازت دی ہے تو یہ اجازت اس سے مشروط سمجھی جائے گی کہ بات وہ ہو جو کم از کم عقل میں سماتی ہو۔ اس کا مطلب ہوا کہ اس طرح کی چیزیں جنھیں عقل کسی طرح باور نہ کرتی اور جو بادیٔ النظر میں بالکل جھوٹ اور غلط نظر آتی ہوں، یہ اجازت ان کو شامل نہ ہوگی اور اس طرح کی چیزوں کا روایت کرنا کسی طرح جائز نہ ہوگا۔"

اسی طرح سورۂ نمل کی آیات ۴۱ تا ۴۴ کی تفسیر میں ملکۂ سبا کے قصے میں حضرت عبداللہ بن عباس سے ایک طویل اثر کو نقل کرنے کے بعد اس پر یہ تبصرہ کرتے ہوئے کہ یہ منکر اور بہت شاذ ہے "منکر" غریب" جدا" آگے فرماتے ہیں: "اس طرح کی چیزیں جو مختلف مقامات پر آتی رہتی ہیں ان کے متعلق قرین قیاس بات یہی ہے کہ یہ اہل کتاب سے اخذ کردہ ہیں اور ان کتابوں میں مذکور ہیں۔ مثال کے طور پر کعب احبار اور وہب بن منبہ کی اکثر روایات اللہ انہیں معاف کرے کہ انہوں نے بنی اسرائیل کے ان دور از کار اور اچنبھے میں ڈالنے والے اخبار و واقعات کو اس امت کے سر بھی تھوپ دیا جن کے بارے میں کچھ پتہ نہیں کہ آیا یہ چیزیں پیش بھی آئیں یا نہیں یا یہ کہ یہ تبدیلی و تحریف کی ستم خوردہ تو نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو ان خرافات سے بے نیاز کر کے اسے وہ چیز عطا کی ہے جو صحت و صداقت میں آپ اپنی مثال ہے جو روزِ روشن کی طرح عیاں اور دوست دشمن ہر ایک کے لئے یکساں مفید ہیں۔ [۳۰]

(۳۰) عمدۃ التفسیر جلد اول، ص: ۱۷

ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں ایک سے زیادہ مقامات پر اس طرح کی اسرائیلی روایات کا پردہ چاک کرنے کی کوشش کی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ انہیں کس قدر ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور انہیں ہاتھ لگانا روا نہیں رکھتے۔ اگرچہ اپنے پیش رو بزرگوں کی پیروی میں ان کا تذکرہ کردیتے ہیں لیکن کہیں کہیں تو وہ انہیں بالکل ہاتھ نہیں لگاتے اور قرآن نے بات کو جس اجمال کے ساتھ بیان کیا ہے اس کو اسی صورت پر باقی رکھتے ہیں اور اس کی تفصیلات کے چکر میں نہیں پڑتے جبکہ اس کے سلسلے میں کوئی صحیح چیز نبی ﷺ سے مروی نہیں۔

مثال کے طور پر وہ سورۃ ''ص'' کی آیت

وَهَلْ اَتَاکَ نَبَأُ الْخَصْمِ اِذْتَسَوَّرُ والْمِحْرَابَ اِذْ دَخَلُوْا عَلٰى دَاوٗدَ فَفَزِعَ مِنْهُمْ.

اور کیا تم تک خبر پہنچی مقدمہ کے فریقوں کی جبکہ وہ دیوار کود کر عبادت خانہ میں آئے۔ جب وہ داؤد کے پاس آبیٹھے تو وہ ان سے گھبرایا۔

''اس مقام پر عام طور مفسرین ایک قصہ نقل کرتے ہیں جس کا بیشتر حصہ اسرائیلیات سے ماخوذ ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی طرف سے اس کے سلسلے میں کوئی چیز ثابت نہیں ہے کہ اسے تسلیم کئے بغیر چارہ نہ ہو۔ ابن ابی حاتم نے اس مقام پر ایک حدیث جو نقل بھی کی ہے تو وہ سنداً صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ اسے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یزید رقاشی نے روایت کیا ہے۔ رقاشی اگرچہ صالحین میں سے تھا لیکن ائمہ حدیث کے نزدیک اس کا ''ضعیف'' ہونا مسلم ہے۔ پس مناسب بات یہ ہوگی کہ اس قصے کو تلاوت کی حد سے آگے نہ بڑھایا جائے اور اس کی تفصیلات کے علم کو اللہ تعالیٰ کے حوالہ کیا جائے۔ اس لئے کہ قرآن کی حقانیت وصداقت میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ اسی طرح اس کی بیان کردہ چیزیں کسی شک وشبہے سے بالاتر ہیں۔

دل چاہتا تھا کہ کاش ابن کثیر اسی سورۂ ''ص'' میں آگے حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصے کے سلسلے میں بھی اپنے اسی موقف پر قائم رہتے۔

وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمَانَ وَاَلْقَيْنَا عَلٰى كُرْسِيِّهٖ جَسَداً ثُمَّ اَنَابَ. (۳۱)

اور ہم نے سلیمان کو آزمایا اور اس کے تخت پر ایک دھڑ ڈال دیا تو وہ رجوع ہوا۔

لیکن افسوس ہے کہ اس مقام پر وہ ان عجیب وغریب روایتوں کو نقل کرنے میں خوب درازنفسی سے کام لیتے ہیں جو عبداللہ بن عباس، قتادہ، سدی، مجاہد اور کعب احبار وغیرہ بزرگوں سے مروی ہیں۔ اگرچہ یہ حضرات سلف میں تفسیر کے امام سمجھے جاتے ہیں اور اسی پہلو سے ہم بھی ان کا احترام کرتے ہیں لیکن افسوس ہے کہ اس مقام پر انہوں نے جو چیزیں بیان کی ہیں انہیں عقل باور کرنے کو تیار ہے نہ کسی نقل صحیح سے ان کی تصدیق ہوتی نظر آتی ہے۔ اسی سلسلے میں ایک روایت وہ ابن ابی حاتم سے نقل کرتے ہیں جسے وہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں۔ موصوف اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ابن عباس تک اس کی اسناد قوی ہے لیکن اگر ان سے یہ روایت صحیح بھی ہو تو لگتا ہے کہ یہ اہل کتاب سے ماخوذ ہوگی جبکہ ان میں سے ایک گروہ وہ ہے جو سرے سے حضرت سلیمان علیہ السلام کی نبوت ہی کا منکر ہے جو ظاہر ہے کہ ان پر جھوٹ باندھنے سے بمشکل ہی چوک سکتا ہے۔ اس کے بعد وہ آخر میں فرماتے ہیں:

''سلف کی ایک بڑی جماعت سے یہ قصہ پوری تفصیلات کے ساتھ مروی ہے۔ مثلاً سعید بن مسیّب اور زید بن اسلم نیز ان کے علاوہ دوسرے بہت سے حضرات لیکن یہ تمام تر تفصیلات اہل کتاب کی روایت کردہ کہانیوں سے ماخوذ معلوم ہوتی ہیں۔ (۳۲)

---

(۳۱) آیت: ۳۴

(۳۲) تفسیر ابن کثیر جلد ۴، ص: ۳۶

اب سوال یہ ہے کہ آخر اس طرح کی چیزوں پر وقت برباد کرنے اور صفحات سیاہ کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے جبکہ ان سے کسی صحیح بات کا پتہ چلتا ہے نہ کسی مستند صحیفہ آسمانی کی ان کو توثیق حاصل ہے۔ ابن کثیر نے سورۂ انبیاء کی آیات ۵۱ تا ۵۶ کی تفسیر کرتے ہوئے کتنی اچھی بات کہی ہے:

''اس تفسیر میں ہمارا طریقہ یہ ہوگا کہ اسرائیلی روایات کے بڑے حصے سے ہم اجتناب کریں گے۔ اس میں پڑنا اپنا وقت ضائع کرنا ہے اس لئے کہ اس میں وہ جھوٹی باتیں بھی شامل ہیں جو ان کے ہاں رواج پکڑے ہوئے تھیں۔ کاش کہ ابن کثیر ان کے ایک بڑے حصے ہی سے نہیں بلکہ اس پورے ذخیرے سے اجتناب کی روش میں کامیاب ہوتے۔ اس لئے کہ اس کا ہر ہر جزا اپنے ساتھ فائدہ کم اور نقصان کے پہلو زیادہ رکھتا ہے۔

اسرائیلیات سے بیزاری اور ان سے ناپسندیدگی اور قرآن حکیم کو ان کی آمیزش سے پاک رکھنے کے سلسلے میں غالباً حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ یہ عَنْ سے روایت کی گئی ہے اور اعمش روایت کرنے والا ہے اسکی تدلیس مشہور ہے۔

کے ان فقروں سے زیادہ بلیغ اور مؤثر کوئی دوسری بات نہ کہی گئی ہوگی جسے امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے اور جسے حافظ ابن کثیر نے سورۂ بقرہ کی آیت ۷۹ کی تفسیر کرتے ہوئے ان لفظوں کے ساتھ نقل کیا ہے:

یَامَعْشَرَ الْمُسْلِمِیْنَ کَیْفَ تَساءَ لُوْنَ اھلَ الْکِتَابِ عَنْ شَیْءٍ وَکِتَابُکُمْ الَّذِیْ اَنْزَلَ اللّٰہُ عَلٰی نبیِّہٖ اَحْدَثُ اَخبَارِ اللّٰہِ تَقْرَؤُنَہٗ مَحضاً لَمْ یَشُبْ! وَقَدْ حَدَّثَکُمُ اللّٰہُ اَنَّ اَھْلَ الْکِتَابِ قَدْ بَدَّلُوْا کِتَابَ اللّٰہِ وَغَیَّرُوْہُ وَکَتَبُوْا بِاَیْدِیْھِمِ الْکِتَابَ وَقَالُوْا ھُوَ مِنْ عِنْدِاللّٰہِ لِیَشْتَرُوْا بِہٖ ثَمَناً قَلِیْلاً اَفَلا یَنْھَا کُمْ مَاجَآءَ کُمْ مِنَ الْعِلْمِ عَنْ

مَسْأَلَتِهِمْ لَا وَاللّٰهِ مَا رَأَيْنَا مِنْهُمْ اَحَداً قَطُّ سَاءَ لَكُمْ عَنِ الَّذِیْ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ.

اے مسلمانو! تم کیونکر اہل کتاب سے کسی چیز کی بابت دریافت کرتے ہو جبکہ تمہاری کتاب جسے اللہ نے اپنے نبی ﷺ پر نازل کیا ہے اللہ کی دی ہوئی خبروں کا سب سے آخری ایڈیشن ہے۔ تم اسے بالکل خالص اور بے آمیز صورت میں پڑھتے ہو۔ جبکہ اللہ اہل کتاب کی بابت تم کو بتا چکا ہے کہ انہوں نے اللہ کی کتاب کو بدل دیا، اس کو کچھ کا کچھ کر دیا۔ انہوں نے کتاب کو لکھا تو اپنے ہاتھ سے اور کہتے یہ کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے تا کہ اس کے ذریعہ تھوڑا نفع کمائیں۔ تو اب جو علم تمہارے پاس آ گیا ہے کیا وہ تمہیں اس سے باز رکھنے کے لئے کافی نہیں ہے کہ تم ان سے کوئی بات دریافت کرو، خدا گواہ ہے! ہم نے ان میں تو کسی کو نہیں دیکھا جس نے کبھی تم سے بھی اس چیز کی بابت پوچھا ہو جو تمہارے پاس نازل کی گئی ہے۔ ۳۳

امام ابن کثیر اور اسرائیلی روایات:

اسرائیلی روایات کے بارہ میں ابن کثیر اپنا نکتہ نظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''ہمارا مسلک یہ ہے کہ تفسیر میں اسرائیلی روایات سے احتراز کیا جائے۔ ان میں پڑنا وقت کا ضیاع ہے اسم قسم کی اکثر روایات میں جھوٹ بھی ہوتا ہے، کیونکہ اس امت کے آئمہ فن اور ناقدین حدیث کی طرح اہل کتاب نے صحیح اور سقیم میں تفریق نہیں کی۔'' ۳۴

بنی اسرائیل کی گائے کا قصہ ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں: ''ابو عبدہ، ابو العالیہ اور سدی سے جو روایات منقول ہیں ان میں اختلاف ہے ظاہر ہے کہ یہ روایات بنی اسرائیل کی کتابوں سے

---

(۳۳) فکری تربیت کے اہم تقاضے (اردو) ڈاکٹر یوسف القرضاوی، ص ۹۰-۱۰۱

(۳۴) تفسیر القرآن العظیم جلد ۳، ص: ۱۸۳-۱۸۲

ماخوذ ہیں بلا شبہ ان کو نقل کرنا درست ہے مگر ان کی تصدیق وتکذیب نہیں کی جاسکتی، لہٰذا ان پراعتماد کرنا درست نہیں ماسوا اس روایت کے جو اسلامی حقائق کے مطابق ہو۔'' (۳۵)

سورۂ انبیاء کی آیت: ۵۱ کے تحت لکھتے ہیں: ''یہ جو قصے مشہور ہیں کہ حضرت ابراھیم علیہ السلام کے دودھ پینے کے زمانے میں ہی ان کی والدہ نے انہیں ایک غار میں رکھا تھا جہاں سے وہ مدتوں بعد باہر نکلے اور مخلوقات خدا پر خصوصاً چاند، تاروں وغیرہ پر نظر ڈال کر خدا کو پہچانا، یہ سب بنی اسرائیل کے افسانے ہیں۔ ان میں سے جو واقعہ کتاب وسنت کے مطابق ہو وہ سچا اور قابل قبول ہے اس لئے کہ وہ صحت کے مطابق ہے اور جو خلاف ہو وہ مردود اور ناقابل قبول ہے اور جس کی نسبت ہماری شریعت خاموش ہو، مخالفت وموافقت میں کچھ نہ ہو، گو اس کا روایت کرنا بقول اکثر مفسرین جائز ہے لیکن نہ تو ہم اسے سچا کہہ سکتے ہیں نہ غلط۔ ان اسرائیلیات میں سے اکثر واقعات ایسے ہیں جو ہمارے لئے کچھ نہیں اور نہ ہی ان میں ہمارا کوئی دینی نفع ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہماری جامع، نافع، کامل شریعت اس کے بیان میں کوتاہی نہ کرتی۔'' (۳۶)

لیکن تفسیر میں ابن کثیر اپنے مؤقف پر پوری طرح کاربند نہ رہے انہوں نے ایسی روایات بھی لکھیں جو ان کے اصول کے مطابق صحیح نہ تھیں۔ (یوسف القرضاوی نے تفصیلات بیان کی ہیں)

شاہ ولی اللہؒ اور اسرائیلی روایات:

الفوز الکبیر میں آپ لکھتے ہیں: ''دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اسرائیلی روایات کا نقل کرنا ایسی بلا ہے جو ہمارے دین میں داخل ہوگئی ہے حالانکہ قاعدہ یہ ہے کہ نہ ان کی تصدیق کرو نہ تکذیب۔ اس قاعدہ سے دو باتیں معلوم ہوئیں:

---

(۳۵) جلد اول ص: ۱۱۰ (۳۶) جلد سوم ص: ۱۸۱

اول یہ کہ جب تک تعریض کلام اللہ، حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں دستیاب ہو سکے بنی اسرائیل سے نقل نہ کرنا چاہیے۔ ولقد فتنا سلیمان والقینا علی کرسیه جسدا ثم تاب کا محمل جبکہ حدیث نبوی میں انشاء اللہ کے ترک کرنے اور اس پر مواخذہ ہونیکا قصہ پایا جاتا ہے تو کیا ضرورت ہے جو صخرہ کا قصہ ذکر کیا جائے۔

دوسرا قاعدہ کلیہ ہے کہ ضروری امر اپنی حد ضرورت تک ہی محدود رہتا ہے اس کے اقتضائے تعریض کی مقدار کو ملحوظ رکھتے ہوئے بیان کرنا چاہیے تاکہ اسکی تصدیق ہم قرآنی شہادت سے کرسکیں اور اس سے زیادہ بیان سے زبان کو روکنا چاہیے۔" (الفوز الکبیر)

حجۃ اللہ البالغہ کی دوسری جلد میں لکھتے ہیں: "اسکی تحقیق یہ ہے کہ جو روایات عبرت کی خاطر ذکر کی جائیں ان کو بنی اسرائیل سے روایت کرنے میں کچھ مضائقہ نہیں، اسی طرح اختلاط حق وباطل کا اندیشہ نہ ہو تب بھی کچھ حرج نہیں، بصورت دیگر قطعاً ان سے روایت نہ کی جائے ،اس موقعہ پر یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جو اسرائیلی روایت کتبِ تفسیر وحدیث میں اہلِ کتاب سے منقول ہیں، وہ ہرگز قابلِ اعتماد نہیں اور کسی عقیدہ یا حکم کو ان پر مبنی کرنا جائز نہیں اچھی طرح سمجھ لو۔" ۳۷

محمد ابوزھو کا کتب تفاسیر میں اسرائیلیات کے بارہ میں مؤقف:

اکابر مفسرین کی تفاسیر میں بکثرت اسرائیلیات کعب اور وہب سے منقول ہیں مثلاً تفسیر ابن جریر وغیرہ۔ اسرائیلیات ذکر کرنے کی بنا پر ان مفسرین کی مذمت نہیں کی جاسکتی اس لئے کہ انہوں نے ان روایات کو اس حیثیت سے ذکر کیا ہے کہ یہ اسرائیلی روایات ہیں اور ان

---

(۳۷) اردو ترجمہ، ص: ۶۳

کوشرع اسلامی کے ترازو میں رکھ کر جانچ پرکھ لینا چاہیئے۔ مزید برآں انہوں نے اسرائیلیات کی سندیں بھی ذکر کردی ہیں اور صحیح وسقم کی چھان پھٹک کا معاملہ پیچھے آنے والوں کیلئے چھوڑ دیا ہے جس طرح محدثین نے احادیث کی تدوین کے وقت کیا تھا۔ اسناد کا ذکر کر کے وہ اس ذمہ داری سے بری الذمہ ہوگئے اس لئے کہ ان کے معاصرین فن اسماء الرجال سے آگاہ تھے مگر اس کا چرچا باقی نہیں رہا۔ جو باتیں کعب اور وہب کی جانب منسوب ہیں ضروری نہیں کہ وہ صحت کے معیار پر پوری اتریں اس لئے کہ وضاعین نے بہت سی باتیں گھڑ کر ان کی جانب منسوب کردیں تھیں جس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ غلط سلط باتوں کو ان کی جانب منسوب کر کے مقبول عام بنایا جائے پھر افسانہ گو مؤرخین، کوتاہ نظر مفسرین اور ادبا نے ان جھوٹے واقعات کو نقل کر کے لوگوں تک پہنچایا اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ یہ واقعات درست ہیں انہوں نے یہ دیکھنے کی زحمت گوارا نہ کی کہ جن کی جانب یہ واقعات منسوب ہیں ان کا ان کے ساتھ کچھ سروکار بھی ہے یا نہیں، چنانچہ یہ خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ کعب اور وہب کا قصور نہیں بلکہ کوتاہ نظری اور سہل انگاری کا جرم ہے۔" ۳۸

(۳۸) تاریخ حدیث ومحدثین، محمد ابوزھو، ص: ۲۶۰ مترجم غلام احمد حریری

حضرت سیدنا آدم علیہ السلام

''حضرت سیدنا آدم علیہ السلام کا اسم مبارک قرآن کریم میں ۲۵ مقامات پر ہے۔[۱]

مجد الدین فیروز آبادی نے لکھا ہے کہ آپ کے پانچ نام ہیں:

الانسان - البشر - ابو البشر - آدم - الخلیفة[۲]

چونکہ آپ ہی سے سلسلہ انسانیت کا آغاز ہوا اس لئے قرآن کریم نے قصہ آدم کو مختلف سورتوں میں ہدایت انسانی کے مختلف پہلوؤں کیلئے ذکر کیا۔

قرآن کریم کی درج ذیل سورتوں میں قصہ آدم علیہ السلام کا کہیں اجمالاً اور کہیں تفصیلاً ذکر موجود ہے۔

سورۃ البقرۃ	سورۃ الاعراف رکوع - ۲
الحجر رکوع - ۳	بنی اسرائیل رکوع - ۷
الکهف رکوع - ۷	طہ رکوع - ۷
ص رکوع - ۵	

ابو البشر سیدنا آدم علیہ السلام کے متعلق اسرائیلی روایات کی ایک کثیر تعداد ہماری کتب تفاسیر میں نقل ہوئی ہے۔ جن میں سے چند درج ذیل ہیں:

---

(۱) المعجم المفهرس لالفاظ القرآن

(۲) بصائر ذوی التمییز فی لطائف الکتاب العزیز جلد ۶ ص: ۲۲

(ا)

آدم علیہ السلام کے بارہ میں عیسائی دنیا میں معروف ہے کہ آپ گناہ لیکر زمین پر آئے۔ اور یہاں آ کر طویل مدت روتے رہے تب آپ کی توبہ کی قبولیت کا مژدہ سنایا گیا۔ انسان کے پیدائشی گناہ گار ہونے کے تصور کا نتیجہ "عقیدہ کفارہ" نکلا۔

الیف ایس خیر اللہ نے لکھا ہے "مسیح پر ایمان لانے والوں کیلئے اسکا مطلب ہے کہ مسیح کی صلیب ہماری کفارہ گاہ ہے۔ یہاں پر کامل قربانی دی گئی۔ یہاں خون بہایا گیا جو تمام بنی نوع انسان کے لئے مؤثر ہے"۔ [۳]

آدم علیہ السلام کی گریہ زاری کے متعلق چند روایات درج ذیل ہیں:

۱۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: آدم و حوا علیہما السلام دو سو برس روئے اور چالیس روز تک کچھ نہ کھایا پیا۔ حضرت آدم سو برس تک حوا کے پاس نہ آئے۔

۲۔ یونس بن حباب اور علقمہ بن مرثد فرماتے ہیں کہ اگر سارے زمین والوں کے آنسو جمع کئے جائیں تو آدم علیہ السلام کے آنسو بڑھ جائیں گے۔ [۴]

لیکن حقیقت یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کی توبہ جنت ہی میں قبول کر لی گئی تھی نہ کہ آپ زمین پر آ کر روتے رہے۔ انّہ ھو التوّاب الرحیم۔ [۵] کا تقاضا یہی ہے۔

---

(۳) قاموس الکتاب ص: ۷۹۱-۷۹۲

(۴) تفسیر الحسنات جلد اول ص: ۱۳۵/ مفاتیح الغیب جلد ۳، ص: ۲۶

تفسیر مظہری جلد اول ص: ۹۷/ الدر المنثور جلد اول ص: ۵۳

(۵) البقرہ: ۳۷

جنت ہی میں توبہ کی قبولیت کے حوالہ سے پیر محمد کرم شاہ لکھتے ہیں: ''نیچے اترنے کا حکم دوبارہوا پہلے لغزش کے صادر ہونے کے بعد پہلے حکم سے اظہار ناراضگی مقصود تھا اور دوسری بار منصب خلافت سنبھالنے کیلئے۔ دونوں حکموں کی غرض وغایت الگ الگ ہے اس لیے یہاں تکرار نہیں''۔[6]

علامہ صابونی لکھتے ہیں کہ آدم علیہ السلام دوبارہ ہبوط کا حکم تاکید کیلئے دیا گیا ہے اور اس امر کو بیان کرنے کیلئے کہ آدم علیہ السلام اور آپ کی اولاد کا قیام زمین میں ہے جنت میں نہیں۔[7]

حضرت علی فرماتے ہیں:

فأهبطه بعدالتوبة ليعمر ارضه بنسله.[8]

''پس اللہ نے آپ کو توبہ (قبول کرنے) کے بعد زمین پر اتارا تا کہ اس (اللہ) کی زمین کو اپنی نسل کے ذریعے آباد کریں''۔

مفتی محمد شفیع لکھتے ہیں:

''اگرچہ زمین پر اترنے کا ابتدائی حکم بطور عتاب اور سزا تھا مگر جب بعد میں خطا معاف کردی گئی تو دوسری مصالح اور حکمتوں کے پیش نظر زمین پر بھیجنے کے حکم کو اسکی حیثیت بدل کر برقرار رکھا گیا اور اب ان کا نزول زمین کے حاکم اور خلیفہ کی حیثیت سے ہوا اور یہ وہی حکمت ہے جس کا ذکر تخلیق آدم کے وقت فرشتوں سے کیا جاچکا تھا کہ زمین کیلئے انکو خلیفہ بنانا ہے۔[9]

---

(٦) ضیاء القران جلد ١، ص: ٥١

(٧) صفوۃ التفاسیر جلد اول ص: ٥١

(٨) نہج البلاغہ جلد ٢، ص: ١٦٠

(٩) معارف القرآن جلد اول ص: ٢٠١

ان عبارات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حضرت سیدنا آدم علیہ السلام زمین پر تشریف لائے تو آپ کی توبہ قبول ہو چکی تھی، لیکن ''یہاں نہ حقیقت میں گناہ تھا اور نہ گناہ سے توبہ اور اسکی قبولیت بلکہ وہ آدم علیہ السلام کی جلالت کے لحاظ سے ایک بلند مرتبہ سے پیچھے رہنا تھا اور اس کے شدتِ احساس کے ساتھ آئیندہ سے اس سے باز رہنے کا عزم توبہ تھا اور خالق کی طرف سے ان کو اپنی پوری مہربانی وعنایت کے استحقاق کی اطمینان دہانی قبول توبہ ہے۔۱۰

جب زمین پر تشریف لانے سے قبل توبہ قبول ہو چکی تو زمین پر آکر گناہ کو یاد کر کے صدیوں رونے کی روایات کو نقل کرنا عیسائیوں کے پیدائشی گناہگار کے تصور کو سہارا دینے کیلئے نہیں تو اور کیا ہے؟

علامہ احمد سعید کاظمی لکھتے ہیں: ''فتاب علیہ : آدم علیہ السلام نے ان کلمات کے ذریعے توبہ کی، اللہ تعالیٰ اسی وقت ان پر رجوع برحمت ہوا اور انکی توبہ قبول فرمالی۔ بعض علماء کے نزدیک آدم علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ سے کلمات لینا اور ان کے ذریعے توبہ کرنا اور انکی توبہ کا قبول ہونا جنت سے اترنے کے بعد ہوا اور توبہ بھی کئی سو سال بعد قبول ہوئی۔ دوسو بلکہ تین سو سال آہ وبکا، گریہ وزاری اور ندامت کے حال میں ان پر گزرے۔

شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر عزیزی میں ص:۱۸۴ جلد اول میں یہی فرمایا ہے لیکن حق یہ ہے کہ جنت سے باہر آنے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو وہ کلمات عطا فرمادیئے تھے اور اسی وقت انہوں نے توبہ کی جو قبول ہوگئی اور اسی وقت اللہ تعالیٰ نے انکی خطا معاف فرمادی۔

(۱۰) فصل الخطاب جلد اول ص:۱۱۳

البتہ یہ ممکن ہے کہ معافی کے باوجود آدم علیہ السلام اپنی لغزش کو یاد کر کے ندامت کے طور پر سالہا سال تک گریہ وزاری میں مشغول رہے ہوں جو خوف وخشیت الٰہیہ کا تقاضا اور کمال عبدیت کی دلیل ہے۔[11]

نصاریٰ کا رد کرتے ہوئے سورۃ الاعراف میں امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''یہاں اس مغالطہ سے متنبہ رہنا ضروری ہے جو نصاری کو پیش آیا وہ سمجھتے ہیں کہ انسان بھی اس دنیا میں شیطان کی طرح لعنتی ہو کر اترا ہے اور اس سے نجات حاصل کرنے کیلئے انہوں نے کفارہ کا ایک خانہ ساز عقیدہ گھڑا ہے۔قرآن نے بقرہ میں بھی اور یہاں بھی نہایت واضح رہنمائی دی ہے کہ آدم توبہ کے بعد اپنی پچھلی خطا کے خمیازے سے بالکل پاک ہو کر اس دنیا میں آئے اور اس دنیا میں ان کا بھیجا جانا اس لئے ہوا کہ وہ اور انکی ذریت شیطان کے مقابل میں اپنے عزم وایمان سے اپنے آپ کو اس عزت کا حق دار ثابت کر دیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کو بخشی اور جو شیطان کے حسد کا باعث ہوئی''۔[12]

(ب)

قصہ آدم کے ضمن میں یہ بات بھی معروف ہے کہ شیطان نے وسوسہ ڈالنے کیلئے کونسا طریقہ اختیار کیا۔کہا یہ جاتا ہے کہ سانپ کے منہ میں بیٹھ کر شیطان اندر گیا۔اس حرکت سے قبل سانپ خوبصورت چوپایہ تھا۔[13]

---

(۱۱)التبیان جلد۱،ص:۱۴۹ (۱۲) تدبر قرآن جلد۳ص:۲۳۷

(۱۳)معالم التنزیل جلداول ص:۶۴/الجامع لاحکام القرآن جلداول ص:۳۱۲-۳۱۳
تفسیر مظہری جلداول ص:۹۵-۹۶/المحرر الوجیز جلداول ص:۱۲۸/تفسیر عبدالرزاق جلد۱،ص:۳۱۶
جامع البیان جلداول ص:۳۳۶-۳۳۷/تبیان القرآن جلد۴ص:۸۳-۸۴

اس روایت کا ماخذ عہد نامہ عتیق کی کتاب تکوین کے یہ الفاظ ہیں:

"پہلے گناہ کا بیان"

"اور سانپ زمین کے سب جانوروں سے جنہیں خداوند بنا چکا تھا مکار تھا۔ اس نے عورت سے کہا کیا درحقیقت خدا نے تمہیں حکم دیا ہے کہ تم باغ کے کسی درخت کا پھل نہ کھانا............الخ (باب-۳)

"اور خداوند خدا نے سانپ سے کہا چونکہ تو نے یہ ملعون کیا ہے تو تمام چرندوں اور درندوں میں تو اپنے پیٹ کے بل چلے گا اور اپنی زندگی کے تمام ایام تو خاک چکھے گا"۔ (باب-۳)

کتاب تکوین کی ان آیات کی بنیاد پر ہماری کتب تفاسیر میں نقل ہونے والی روایات اس درجہ صحت کو نہ پہنچ سکیں کہ انہیں قبول کیا جائے۔

محتاط مفسرین نے ان روایات کو قبول نہیں کیا۔ امام رازی لکھتے ہیں:

اعلم ان هذا و امثاله يجب ان لايلتفت اليه.

یعنی یہ اور اس جیسی روایات کی طرف توجہ ہی نہ کرنی چاہیے۔[۱۴]

ابوحیان اندلسی لکھتے ہیں: وقد اكثر المفسرون فی نقل قصص كثيرة فی قصه آدم وحوا والحية والله اعلم بذلک.

مفسرین نے آدم، حوا اور سانپ کے بارے میں بکثرت قصے نقل کئے ہیں اور حقیقت حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں: "وقد ذكر المفسرون هٰهنا اخبار اسرائيلية"

---

(۱۴) مفاتیح الغیب جلد ۳، ص: ۱۵

مفسرین نے یہاں بہت سے اسرائیلی قصے نقل کر دیئے ہیں۔۱۵

علامہ مراغی لکھتے ہیں:

آدم علیہ السلام اور حوا کا جنت سے زمین پر آنے کے بارہ میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ اکثر اسرائیلیات میں سے ہے۔ اہل علم کے نزدیک یہ صحیح نہیں۔۱۶

علامہ بلاغی لکھتے ہیں: قد رویت فی کیفیة وصوله الیها والوسوسة والمخاطبة بالاغواء روایات لم تصح (آلاء الرحمن)

شیطان آدم و حوا تک کیوں کر پہنچا اور وسوسہ انگیزی کس طرح کی ورغلانے کے لئے کیا گفتگو کی، اس سب کے بارے میں ایسی روایات آئی ہیں جو پایہ صحت تک نہیں پہنچیں۔۱۷

مولانا عبدالماجد دریا آبادی لکھتے ہیں: ''ہمارے مفسرین نے بھی ایک طویل قصہ نقل کیا ہے جس میں شیطان سانپ، طاؤس سب کا ذکر آیا ہے، یہ قصہ بجائے خود کہاں تک صحیح ہے اس سے یہاں بحث نہیں کہنا صرف یہ ہے کہ یہ اسلامی عقائد میں بہرحال داخل نہیں اور اسکا ماخذ قرآن وسنت نہیں بلکہ اسرائیلی روایات ہیں اس لئے جو اہل تفسیر زیادہ محتاط، محقق ہوئے وہ اس سے الگ ہی رہے ہیں بلکہ اس سے احتیاط ہی کی تنبیہ کر گئے ہیں''۔۱۸

علامہ احمد سعید کاظمی لکھتے ہیں: ''جن اقوال میں مور اور سانپ کے ذریعہ شیطان کے جنت میں داخل ہونے کا ذکر وارد ہے یا از خود اسکا جنت کے دروازے تک پہنچ جانا مذکور ہے وہ سب از قبیل اسرائیلیات اور ناقابل التفات ہیں۔۱۹

---

(۱۵) تفسیر القرآن العظیم جلد اول ص:......

(۱۶) المراغی جلد اول ص:۹۳ (۱۷) فصل الخطاب جلد اول ص:۱۱۱

(۱۸) تفسیر ماجدی اردو جلد اول ص:۱۸ (۱۹) التبیان جلد اول ص:۱۴۱

محققین کے نزدیک جب یہ طے ہوا کہ توبہ جنت ہی میں قبول ہوگئی، شیطان اور سانپ والا قصہ بھی باطل ہے تو پھر شیطان نے کس طرح وسوسہ ڈالا۔ اس بارہ میں امام بیضاوی کی تحقیق کے مطابق شیطان کا اعزاز کے طور پر وہاں رہنا اور داخل ہونا ممنوع قرار دیا گیا تھا اور ایسی ممانعت نہ ہوئی تھی کہ داخل نہ ہو سکے چونکہ آدم وحواء کا امتحان مقصود تھا اس لئے وسوسہ کیلئے داخلہ کا موقع دیا گیا۔ علامہ قاسمی کے نزدیک وسوسہ ڈالنے کا عمل مشافھۃ ہوا۔ ابن مسعود، ابن عباس اور جمہور علماء کی یہی رائے ہے اور اسکی دلیل قرآن کریم کی آیات کا اسلوب ہے۔

قرآن میں ہے: ھل ادلک علی شجرۃ الخلد وملک لا یبلی. [۲۰]

کیا میں تمہیں آگاہ کروں ہمیشگی کے درخت پر اور ایسی بادشاہی پر جو کبھی زائل نہ ہو۔

ما نھا کما ربکما عن ھذہ الشجرۃ الا ان تکونا ملکین اَوتکونا من الخلدین. [۲۱]

(اور کہا) تمہیں تمہارے رب نے اس درخت سے اس لئے منع فرمایا ہے کہ کہیں تم دو فرشتے ہو جاؤ یا ہمیشہ جینے (زندہ رہنے) والے۔

وقاسمھما انی لکما لمن النصحین. [۲۲]

اور ان سے قسم کھائی کہ میں تم دونوں کا خیر خواہ ہوں۔

ظاہر ہے کہ قسمیں اٹھانے کا یہ عمل آمنے سامنے ہوا۔ [۲۳]

حفظ الرحمٰن سیوہاروی اس سلسلہ میں کہ شیطان نے کس طرح وسوسہ ڈالا، لکھتے ہیں:

''علماءِ اسلام سے اسکے دو جواب منقول ہیں اور دونوں کسی تاویل کے بغیر چسپاں ہیں:

(۲۰) طٰہٰ آیت: ۱۲۰ (۲۱) الاعراف آیت: ۲۰

(۲۲) الاعراف آیت: ۲۱ (۲۳) محاسن التاویل جلد اول ص: ۲۸۳

(۱) اگرچہ ابلیس جنت سے نکال دیا گیا لیکن پھر بھی اسکا ایک گناہ گار اور نابکار مخلوق کی حیثیت سے جنت کے اندر داخل ہونا اس کے مردود ہونے کے منافی نہیں ہے۔ اس لئے اس نے اسی حیثیت سے اندر جا کر حضرت آدم وحواء سے یہ گفتگو کی اور ان کو لغزش میں ڈال دیا۔ آیت اهبطو منها جميعا اسی کی تائید کرتی ہے کہ عاصی کی حیثیت سے ابھی تک اسکا داخلہ ممنوع نہیں تھا۔

(۲) جس طرح ایک آواز ٹیلی فون اور ریڈیو کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ دور جا سکتی ہے یا جس طرح وائرلیس میں صرف شعاعوں اور آواز کی لہروں کے ذریعہ سے ایک پیغام ہزاروں میل دور پہنچایا جا سکتا ہے اس طرح یہ بھی کیوں ممکن نہیں کہ قربت یا بالمشافہ مخاطبت کے بغیر شیطان کا وسوسہ نفسِ انسانی تک پہنچ جائے اور اس پر اثر انداز ہو تب واقعہ کی صورت یہ ہوئی کہ شیطان نے جنت سے باہر رہ کر حضرتِ آدم اور حواء کے قلوب میں یہ وسوسہ ڈالا اور انکو بہکانے کی کوشش کی آیت فوسوس لهما الشيطن سے یہی ظاہر ہے۔''[۲۴]

(ج)

کتب تفاسیر میں اسرائیلی روایات کے حوالہ سے حضرت آدم وحوا کے بارہ میں ایک روایت، آیت هو الذى خلقكم من نفس واحدة وجعل منها زوجها......[۲۵] کہ وہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا پھر اس سے اسکی بیوی بنائی تا کہ وہ اس سے سکون حاصل کرے، کے تحت درج کی ہے جسکا خلاصہ درج ذیل ہے:

''حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب حوا حاملہ ہو گئیں تو ان کے پاس ابلیس گیا، حوا کا کوئی بچہ زندہ نہیں رہتا تھا، ابلیس نے ان سے کہا تم اسکا نام

(۲۴) قصص القرآن حصہ اول ص: ۳۷-۳۸ (۲۵) الاعراف: ۱۸۹

عبدالحارث رکھ دو، انہوں نے اسکا نام عبدالحارث رکھ دیا پھر وہ بچہ زندہ رہا۔ یہ کام شیطان کے وسوسہ سے تھا''۔ ۲۶

اس روایت کا مضمون خود ہی اس کے بطلان کی دلیل ہے حضرت سیدنا آدم علیہ السلام جو خلیفۃ اللہ تھے وہ اپنے بیٹے کا نام عبدالحارث (بندہ شیطان) کیوں رکھتے یہ اور بھی عجیب بات ہے جو کہ شیطان کی کرامت کا بیان ہے کہ جب بچے کا نام اسکے نام پر رکھا تو وہ بچہ زندہ رہا۔

نفس واحدہ قرآن مجید میں پانچ مقامات پر آیا ہے۔

الاعراف آیت: ۱۸۹	نساء آیت: ۱
الانعام آیت: ۹۸	لقمان آیت: ۲۸
الزمر آیت: ۶	

زیر بحث آیت میں واحد سے مراد واحد شخصی نہیں بلکہ واحد نوعی ہے چنانچہ شروع میں اگر چہ تثنیہ کے صیغے ہیں جو مرد اور عورت کے لحاظ سے ہیں اور فعل بھی ماضی ہیں جس سے شبہ ہوتا ہے کہ یہ گذرے ہوئے خاص واقعہ کا اظہار ہے مگر آخر میں ''فتعالی اللہ عما یشر کون'' جمع اور حال کا صیغہ آ گیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ وہ عام انسانوں کی بات ہے جو ان کی حالی کیفیت سے متعلق ہے جناب آدم اور حواء کا کوئی خاص گذرا ہوا واقعہ بیان نہیں ہو رہا ہے۔ ۲۷

(۲۶) سنن الترمذی رقم الحدیث ۳۰۸۸/ مسند احمد جلد ۷ رقم الحدیث ۲۰۱۳۷

المستدرک جلد ۲، ص: ۵۴۵/ جامع البیان جز ۹، ص: ۱۹۳

تفسیر مظہری جلد ۴، ص: ۴۴۱-۴۴۲/ معالم التنزیل جلد ۲، ص: ۲۲۱

تفسیر امام عبدالرزاق رقم الحدیث: ۹۶۸

(۲۷) فصل الخطاب جلد ۳، ص: ۳۸۱

امام قرطبی اس واقعہ کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

ونحو هذا مذكور من ضعيف الحديث، فی الترمذی وغيرهٔ وفی الاسرائيليات كثيرليس لها ثبات.

یہ ترمذی کی ضعیف حدیث میں مذکور قصہ ہے اور اسرائیلیات سے ہے جس میں سے کچھ بھی ثابت نہیں۔[۲۸]

امام رازی نے اس قصہ کو متعدد وجوہ سے باطل ثابت کیا ہے۔آپ لکھتے ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ نے فتعالی اللہ عمایشرکون کہا یہ اس چیز پر دلالت کرتا ہے کہ جنہوں نے شرک کیا وہ ایک جماعت ہے۔

۲۔ اس آیت کے بعد فرمایا أیشرکون مالایخلق شیئاً وهم یخلقون.[29]

کیا وہ شریک کرتے ہیں انہیں جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرسکتے اور وہ خود بنائے جاتے ہیں) یہ الفاظ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ مقصود ان لوگوں کا رد ہے جنہوں نے بتوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرایا اور اس آیت میں ابلیس کے بارہ میں کچھ بھی بیان نہیں۔

۳۔ اگر یہاں ابلیس مراد ہوتا تو آیت کے الفاظ یوں ہوتے:

ایشرکون من لایخلق شیئاً.

حالانکہ آیت اس طرح ہے

أیشرکون مالایخلق شیئاً.

---

(۲۸) الجامع لاحکام القران جلد ۴، ص: ۳۳۸

(۲۹) الاعراف: ۱۹۱

کیونکہ عاقل کیلئے من کا صیغہ استعمال ہوتا ہے نہ کہ ''ما'' کا۔

۴۔ آدم علیہ السلام ابلیس کو پہچانتے تھے اور تمام اسماء کے عالم تھے۔ آپ کو یقیناً یہ بھی علم تھا کہ ابلیس کا نام حارث ہے۔ اس علم کے ہوتے ہوئے اور شیطان سے دشمنی اور عداوت کے باوجود یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اپنے بیٹے کا یہ نام رکھتے کیا نام کم ہوگئے تھے کہ اس نام کے علاوہ کوئی اور نام نہ ملا؟ ۳۰

علامہ طبرسی لکھتے ہیں: ''کیوں کہ انبیاء معصوم ہیں، شرک گناہ اور شیطان کی اطاعت کا الزام ان پر نہیں لگایا جاسکتا۔ ۳۱

امام ابن کثیر لکھتے ہیں: ''یہ روایت اہل کتاب کے آثار سے ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث صحیح ہے کہ جب اہل کتاب تم سے حدیث بیان کریں تو ان کی تصدیق کرو نہ تکذیب۔ اہل کتاب کی روایات تین قسم کی ہیں:

۱۔ جنکا صحیح ہونا کتاب وسنت سے معلوم ہے۔

۲۔ جنکا کذب کتاب وسنت سے معلوم ہے۔

۳۔ بعض وہ ہیں جنکا صدق وکذب متعین نہیں۔

اس روایت کا کذب ہمیں معلوم ہے۔ ۳۲

پیر محمد کرم شاہ لکھتے ہیں:

محققین علماء کرام کے نزدیک یہ روایت مردود ہے۔ ۳۳

---

(۳۰) مفاتیح الغیب جلد ۱۵ - ص: ۸۶ (۳۱) مجمع البیان جلد ۴، ص: ۵۱۰

(۳۲) تفسیر القرآن العظیم جلد ۲، ص: ۳۶۶ / الفتح الربانی جلد ۲۰، ص: ۳۴

صفوۃ التفاسیر جلد اول، ص: ۴۸۷ (۳۳) ضیاء القرآن جلد دوم ص: ۱۱۲

مسند احمد وغیرہ میں اس قصہ کے ضمن میں نقل ہونے والی روایت متعدد وجوہ سے قابل قبول نہیں۔

(۱) ایک علت تو اس میں یہ ہے کہ وہ ''حسن عن سمرة'' کے طریق سے مروی ہے اور حضرت حسن بصری کا سماع سمرہ بن جندب سے مختلف فیہ ہے۔

حضرت حسن بصری کا عنعنہ تدلیس کی بنا پر نا قابل قبول ہے۔

(۲) دوسری علت اسکی سند میں یہ ہے کہ اس میں عمر بن ابراھیم ہے اور عمر بن ابراھیم متکلم فیہ راوی ہے۔

(د)

قابیل اور ہابیل کے قصہ میں کتب تفاسیر میں یہ نقل کیا گیا ہے کہ یہ ''وجود زن'' کا معاملہ تھا۔ حالانکہ قرآن کریم نے فقط اتنا ذکر کیا کہ دونوں بھائیوں نے قربانی دی ان سے ایک کی قبول ہوگئی اور دوسرے کی نہ قبول ہوئی دوسرے نے پہلے کو کہا کہ میں تمہیں قتل کر ڈالوں گا۔ پہلے نے ایک جامع اصول ذکر کر دیا۔

قال انما یتقبّل الله من المتّقین. [۳۴]

کہ اللہ تعالیٰ صرف متقین کی قربانی قبول کرتا ہے۔

اسی چیز کو قرآن کریم نے دوسرے مقام پر اس انداز میں بیان کیا ہے

لن ینال الله لحومها ولا دمائها ولکن یناله التقوی منکم [۳۵]

اللہ تعالیٰ کو ان کے گوشت نہیں پہنچتے اور نہ ان کے خون البتہ اس کے حضور تمہاری طرف سے تقویٰ پہنچتا ہے۔

---

(۳۴) الاعراف آیت: ۲۷ (۳۵) الحج آیت: ۳۷

قتل کے بعد قابیل اپنے بھائی ہابیل کی لاش اٹھائے پھرتا رہا۔ دو کوّے آئے ایک نے دوسرے کو مارا، قابیل نے کوّے کے اس فعل سے دفن کرنے کا عمل سیکھا۔ اس واقعہ کی تفصیلات معالم التنزیل [۳۶] روح البیان [۳۷] روح المعانی [۳۸] الکشاف [۳۹] الحسنات [۴۰] میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ حقیقت حال یہ ہے کہ قرآن کریم نے قربانی کا سبب "وجود زن" کو قرار دیا اور نہ دو کوّے آنے کا ذکر کیا۔

پیر محمد کرم شاہ قتل کے سبب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"قابیل اپنے بھائی ہابیل سے کیوں حسد کرتا تھا اس کے جواب میں مفسرین نے بہت کچھ لکھا ہے لیکن کوئی یقینی چیز نہیں جسے پیش کرتے وقت دل میں خلش محسوس نہ ہو اس لئے اس سے قطع نظر کر کے صرف وہی کچھ عرض کرنا عبرت کیلئے کافی ہے جو قرآن حکیم نے بتایا ہے"۔[۴۱]

قتل کی کیفیت کا ذکر کرتے ہوئے امام ابن جریر لکھتے ہیں:

صحیح یہ ہے کہ اللہ عزوجل نے یہ خبر دی ہے کہ ابن آدم نے اپنے بھائی کو قتل کر دیا اور یہ خبر نہیں دی کہ کس کیفیت میں قتل کیا اور نہ رسول کریم ﷺ نے اسکو بیان فرمایا، سو ہمیں اتنا ہی یقین رکھنا چاہیے جتنا رسول اللہ ﷺ نے بتایا ہے۔[۴۲]

---

(۳۶) جلد ۲، ص: ۲۸ (۳۷) جلد ۲، ص: ۳۸۹

(۳۸) جلد ۳، ص: ۲۸۲ (۳۹) جلد اول ص: ۶۲۴

(۴۰) جلد دوم، ص: ۱۲۵ (۴۱) ضیاء القرآن جلد اول ص: ۴۶۰

(۴۲) جامع البیان جلد ۶، ص: ۳۰-۳۱

حضرت سیدنا ابراهیم علیہ السلام کا دعا نہ کرنا

حضرت ابراھیم علیہ السلام کے بارہ میں یہ روایت معروف ہے:

"جب حضرت ابراھیم علیہ السلام کو نمرود کی جلائی ہوئی آگ میں ڈالا جانے لگا تو حضرت جبرئیل نے آ کر عرض کیا: آپ کو کوئی حاجت ہے؟ آپ نے فرمایا تمہاری طرف کوئی حاجت نہیں ہے۔ انہوں نے کہا پھر اپنے رب سے سوال کیجئے انہوں نے فرمایا: اس کو میرے حال کا جو علم ہے وہ میرے لئے کافی ہے"۔[1]

اس روایت کے بارہ میں علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں:

"اس کو بعض مفسرین کے سوا اور کسی نے ذکر نہیں کیا"۔

امام ابن جریر، حافظ ابن کثیر، حافظ ابن عساکر اور حافظ سیوطی نے اس واقعہ کو متعدد اسانید کے ساتھ ذکر کیا اور ان تمام روایات میں صرف یہ الفاظ ہیں کہ جب جبرائیل نے کہا: آپ کی کوئی حاجت ہے؟ تو حضرت ابراھیم علیہ السلام نے فرمایا تم سے کوئی حاجت نہیں اور یہ الفاظ نہیں ہیں:

"اسکو میرے حال کا جو علم ہے وہ میرے لئے کافی ہے"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں اسکی کوئی اصل نہیں ہے اور یہ غالباً اسرائیلیات میں سے ہے اور یہ حدیث معلل ہے کیونکہ قرآن مجید کی متعدد آیات میں اور بہ کثرت احادیث میں

---

(۱) معالم التنزیل جلد ۳، ص: ۲۱۱

اللہ تعالیٰ سے دعاء کرنے کی ترغیب اور تلقین کی گئی ہے اور یہ حدیث ان کے مخالف ہے کیونکہ اس میں ترک دعاء کی تصریح ہے اور ہمارے لئے حجت قرآن اور حدیث ہے نہ کہ یہ بے اصل اور معلل روایت''۔[۲]

علامہ ناصرالدین الالبانی نے بھی اسے اسرائیلی روایت قرار دیا ہے اور کہا ہے ''لا اصل لہ'' ابن تیمیہ نے اسے موضوع قرار دیا۔[۳]

---

(۲) تبیان القرآن جلد ۴، ص: ۱۶۹-۱۷۰

(۳) سلسلۃ الاحادیث الضعیفہ والموضوعۃ جلد اول، صفحہ ۲۹-۲۸

تعمیر کعبہ

الکعبة المشرفة روئے زمین پر پھیلے ہوئے مسلمانوں کی عقیدت ومحبت کا مرکز اور نماز کیلئے قبلہ ہے۔

قرآن کریم اور احادیث نبویہ میں اسکی عظمت وشان کا حوالہ متعدد مقامات پر آیا ہے۔ اسکی تعمیر کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

ان اول بیت وضع للناس [1]

کہ یہ دنیا میں عبادت الٰہی کے لئے بنایا جانے والا پہلا گھر ہے۔ اسکو قبلہ بنانے کیلئے مصطفیٰ کریم ﷺ کی آرزؤں کو اس طرح بیان کیا: قد نری تقلب وجھک فی السماء فلنولینک قبلة ترضٰھا فول وجھک شطر المسجد الحرام. [2]

ہم دیکھتے رہے ہیں بار بار آپ کا منہ آسمان کی طرف کرنا، تو ہم ضرور پھیر دیں گے آپ کو اس قبلہ کی طرف جسے آپ پسند کرتے ہیں (لو) اب پھیر لو اپنے چہرہ کو مسجد حرام کی طرف۔

امام الانبیاء ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میری مسجد میں ایک نماز دیگر مساجد میں ایک ہزار نماز سے افضل ہے سوائے مسجد حرام کے اور مسجد حرام میں ایک نماز دیگر مساجد میں ایک لاکھ نماز ادا کرنے سے بہتر ہے۔'' [3]

---

(۱) آل عمران: آیت ۹۶ (۲) البقرہ: آیت ۱۴۴

(۳) صحیح سنن ابن ماجہ جلد اول، ص: ۴۲۱، رقم الحدیث: ۱۱۶۳

کعبہ کی اسی عظمت وفضیلت کی وجہ سے علماء نے اپنی تصانیف میں اس مقدس گھر کے حوالہ سے مختلف معلومات اکٹھی کی ہیں۔ جن میں الازرقی[۴] الفاسی، ابن فھد، المحب الطبری، الفاکھی اور ابن اسحاق شامل ہیں۔ اس موضوع پر لکھنے والوں میں محمد طاہر الکردی[۵]، اور شیخ حسین عبداللہ باسلامۃ[۶] شامل ہیں۔ کتب تفاسیر اور سیر میں اس موضوع پر سیر حاصل بحث موجود ہے۔ مستشرقین نے بھی اس موضوع پر تحقیقات کی ہیں۔

شعراء نے اس حوالہ سے شعر لکھے، زہیر کا شعر ہے:

فاقسمت بالبیت الذی طاف حولہ

رجال بنوہ من قریش وجرھم

میں قسم کھاتا ہوں اس گھر کی جس کے اردگرد طواف کیا جاتا ہے اسے بنو قریش اور بنو جرھم نے بنایا ہے۔[۷]

کعبہ کے احترام کی وجہ سے لوگ اپنی عمارتوں کی مربع شکل نہ بناتے۔[۸] بدیل بن ورقہ نے سب سے پہلے مربع شکل کا مکان بنایا۔[9]

---

(۴) ازرقی کی کتاب اخبار مکہ اس موضوع پر معروف کتاب ہے۔

(۵) کتاب کا نام "التاریخ القویم لمکۃ وبیت اللہ الکریم" ہے۔

(۶) کتاب کا نام "تاریخ الکعبۃ المعظمۃ" ہے۔

(۷) المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام جلد ۶، ص: ۴۳۰

(۸) المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام جلد ۶، ص: ۴۳۲

(۹) صبح الاعشی جلد اول ص: ۴۸۵

کعبہ شریف کی اولین تعمیر کے بارے میں چند باتیں تحریر کرنا مقصود ہیں۔علامہ قسطلانی نے شرح بخاری میں کعبہ کی تعمیر کے بارے میں لکھا ہے کہ دس مرتبہ ہوئی۔

۱۔ آدم علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے فرشتوں نے کعبہ بنایا۔

۲۔ آدم علیہ السلام نے بنایا۔

۳۔ آپ کے بیٹوں نے تعمیر کیا۔

۴۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر۔

۵۔ عمالقہ

۶۔ قبیلہ جرہم کی تعمیر

۷۔ قصی بن کلاب

۸۔ قریش مکہ

۹۔ حضرت عبداللہ بن زبیر

۱۰۔ حجاج بن یوسف ثقفی[۱۰]

---

(۱۰) ارشادالساری جلد۳ص:۱۴۳-۱۴۴

اس سلسلہ تعمیر کی مزید تفصیلات کیلئے ملاحظہ فرمائیں:

اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۱۷ص:۳۲۴-۳۲۵/تفسیر ابن جریر جلد اول ص:۳۲۸-۳۲۹

الدر المنثور جلد اول ص:۱۲۵-۱۳۷/ فتح الباری جلد ۷ص:۳۶۲-۳۶۷

عمدۃ القاری جلد ۱۶ص:۲۸۸/ دلائل النبوۃ جلد دوم ص:۴۴-۴۵

سبل الھدی جلد اول ص:۱۴۶-۱۶۸/معجم البلدان جلد ۴ص:۵۲۶-۵۲۷

روح البیان جلد اول ص:۲۳۲/تہذیب الاسماء واللغات للنووی جلد سوم ص:۱۲۴

بدائع الزھور فی وقائع الدھور ازمحمد بن احمد ابن ایاس حنفی ص:۷۲-۷۱

لیکن قرآن کریم اور احادیث صحیحہ سے ہمیں جو تفصیلات ملتی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ کعبہ کی اولین تعمیر حضرت ابراھیم علیہ السلام نے کی۔ قرآن کریم نے بناء کعبہ کو حضرت ابراھیم علیہ السلام ہی سے منسوب کیا ہے اور آپ سے پہلے کعبہ کا ذکر نہیں ملتا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایسی ساری روایات یہود نے امت محمدیہ کا تعلق ملت ابراھیمی سے توڑنے کیلئے گڑھی ہیں۔ حضرت سیدنا اسحاق علیہ السلام کو ذبیح اللہ کہنا بھی یہودیوں کی انہی سازشوں کی کڑی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ محتاط محققین نے ایسی روایات کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حج کے تمام مناسک حضرت ابراھیم ہی سے متعلق ہیں کہ ان مناسک کے حوالہ سے کسی اور نبی کا صحیح روایت میں ذکر نہ ہونا بھی اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ کعبہ کے اولین معمار حضرت سیدنا ابراھیم علیہ السلام ہیں۔

اس سلسلہ میں علماء کی آراء درج ذیل ہیں۔

علامہ ابوحیان نے ''البحر المحیط'' میں اس موضوع پر ان الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا: وطوّلوا فی ذلک باشیاء لم یتضمّنها القرآن ولا الحدیث الصحیح وبعضها یناقض بعضاً.[۱۱]

یعنی مفسرین نے اس میں ایسے طویل قصے بیان کئے ہیں جو قرآن مجید میں نہیں، کسی صحیح حدیث میں بھی وہ وارد نہیں ہوئے اور ان میں تناقص بھی پایا جاتا ہے۔ ان روایات میں ضعف کی بناء پر آپ لکھتے ہیں: ولا ینبغی اَن یعتمد الاعلیٰ ماصح فی کتاب اللہ وسنة رسول اللہ صلی اللہ علیه وآله وسلم.[۱۲]

---

(۱۱) البحر المحیط جلد اول ص: ۳۸۷

(۱۲) البحر المحیط جلد اول ص: ۳۸۷

یعنی قرآن اور صحیح حدیث کے سوا کسی دوسری چیز پر اعتماد کرنا مناسب نہیں۔

برصغیر کے نامور محقق شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''اولاد آدم علیہ السلام کی خانہ کعبہ کی تعمیر کے سلسلہ میں وہب بن منبہ سے روایت کیا گیا ہے کہ خانہ کعبہ کو پانچ مرتبہ تعمیر کیا گیا ہے۔

سب سے پہلے حضرت شیث علیہ السلام نے تعمیر کیا۔ اسکو ابن عبدالبر نے تمہید میں بیان کیا ہے۔ دوسری مرتبہ حضرت خلیل علیہ السلام نے تعمیر کیا اسکا ذکر قرآن وسنت نبوی ﷺ میں موجود ہے۔ امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سب سے پہلے خانہ کعبہ کی تعمیر حضرت خلیل علیہ السلام نے کی ہے اسی طرح فاکہی نے اپنی سند کے ساتھ اور ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں جزم کے ساتھ بیان کیا ہے کہ کسی خبر میں یہ نہیں آیا کہ حضرت خلیل علیہ السلام کے گھر سے پہلے یہاں کوئی گھر تھا۔''[۱۳]

حضرت شیخ نے ابن کثیر کی جس تحقیق کا ذکر کیا ہے وہ تفسیر ابن کثیر اور البدایہ والنہایہ میں تفصیل سے درج ہے۔ امام ابن کثیر کعبہ کی تعمیر کے سلسلہ کی روایات پر تبصرہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ ساری روایات اسرائیلیات سے ہیں۔ نبی کریم ﷺ سے کوئی صحیح حدیث ثابت نہیں ہے۔ عبداللہ بن عمرو بن العاص سے مروی روایت ابن لہیعہ[۱۴] کے تفردات سے ہے۔ اور ابن لہیعہ ضعیف ہے یا ہوسکتا ہے روایت موقوف ہو اور عبداللہ بن عمرو بن العاص نے ان کتابوں سے بیان کیا ہو جو انہیں جنگ یرموک میں دو بوریوں میں ملی تھیں۔''[۱۵]

---

(۱۳) مدارج النبوۃ (اردو ترجمہ مفتی غلام معین الدین) جلد دوم ص: ۴۷

(۱۴) ابن لہیعہ کیلئے ملاحظہ فرمائیں ص: ۱۱۰/تہذیب الکمال جلد: ۱۰ ص: ۴۵۷-۴۵۰

تہذیب التہذیب جلد: ۵، ص: ۳۷۸-۳۷۹ (۱۵) تفسیر ابن کثیر جلد اول ص: ۵۰۰

ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ اس سلسلہ میں کوئی حدیث صحیح نہیں ہے کہ حضرت ابراھیم سے پہلے کعبہ موجود تھا، جن لوگوں نے لفظ مکان البیت (۱۶) سے اسکو ثابت کیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ (۱۷) محمد بن ابوشھبہ لکھتے ہیں: "علامہ سیوطی، ازرقی دیگر مؤرخین ومفسرین نے اس آیت (سورۃ البقرہ آیت ۱۲۷) کے تحت خانہ کعبہ کے بارے میں بہت سے قصے نقل کئے ہیں اور انہوں نے صحیح اور غلط میں فرق بھی نہیں کیا۔

خانہ کعبہ کب بنا؟

حضرت ابراھیم سے پہلے کس نے بنایا؟

حضرت آدم علیہ السلام نے اسے تعمیر کیا یا فرشتوں نے؟

ان تمام پہلوؤں پر علامہ سیوطی نے تقریباً دس صفحے لکھے ہیں۔ جن میں سے عشر عشیر بھی مشکل سے صحیح ہے۔" (۱۸)

یہی مصنف اپنی سیرت کی کتاب میں لکھتے ہیں: "متواتر آیات اوراحادیث صحیحہ جو بخاری میں روایت ہوئیں اور آئمہ نے نقل کی ہیں اس پر دلالت کرتی ہیں کہ سب سے پہلے کعبہ حضرت ابراھیم علیہ السلام نے تعمیر کیا اور آپ کے لخت جگر سیدنا اسماعیل علیہ السلام نے معاونت فرمائی۔" (۱۹)

ابن عاشور اپنی تفسیر التحریر والتنویر میں لکھتے ہیں:

"اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت ابراھیم علیہ السلام نے بنایا اور قرآن نے متعدد مقامات

---

(۱۶) سورۃ الحج کی آیت ۲۶ کی طرف اشارہ ہے

(۱۷) البدایہ والنھایہ جلد اول ص: ۱۸۲

(۱۸) الاسرائیلیات والموضوعات فی کتب التفسیر ص: ۱۶۸

(۱۹) السیرۃ النبویۃ فی ضوءِ القرآن والسنۃ جلد اول ص: ۱۲۵

پر اس کا ذکر کیا اور اگر پہلے انبیاء میں سے کسی نے بنایا ہوتا تو اسکی شان کی بناء پر قرآن ضرور ذکر کرتا۔" [۲۰]

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ان روایات کی صحت سے انکار کیا ہے آپ لکھتے ہیں:

"مورخین نے ایسی بہت سے باتیں لکھی ہیں جن کا ذکر نہ قرآن پاک میں ہے اور نہ احادیث صحیحہ سے ان پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ روائتیں بھی متفق نہیں بلکہ ایک دوسری سے متصادم ہیں اور ایک دوسری سے متناقض ہیں۔ رطب و یابس کہانیوں اور قصوں کو لکھنے کی جو اخباریوں کی عادت ہے، اسی عادت کے نتیجہ میں یہ بے سند باتیں لکھ دی ہیں۔"

مختلف روایات نقل کرنے کے بعد آخر میں لکھتے ہیں: "اسی طرح کی اور بھی کئی روایات ہیں جو صحیح نہیں ہیں۔" [۲۱]

سیرت حلبیہ میں ہے:

"حق یہ ہے کہ پورا کعبہ صرف تین بار تعمیر ہوا۔ پہلی مرتبہ ابراھیم علیہ السلام نے بنایا دوسری مرتبہ قریش نے دونوں کے درمیان دو ہزار سات سو پچھتر (2775) سال کا فاصلہ تھا اور تیسری مرتبہ ہدم کعبہ کے بعد کعبہ کی پوری تعمیر عبداللہ بن زبیر نے فرمائی۔ ان دونوں کے درمیان بیاسی (82) برس کا فاصلہ تھا۔ فرشتوں کی بناء کعبہ اور آدم علیہ السلام اور ان کے بیٹوں کی تعمیر کعبہ کا صحیح ہونا پایہ ثبوت کو نہیں پہنچا۔ قبیلہ جرہم، عمالقہ اور قصی بن کلاب کی بناء پورے کعبہ کی نہ تھی بلکہ وہ جزوی تعمیر اور ترمیم تھی۔

ہدم کے بعد پورے کعبہ کی تعمیر صرف دو مرتبہ ہوئی۔ ایک مرتبہ قریش کے زمانہ میں

---

(۲۰) التحریر والتنویر

(۲۱) روح المعانی جلد اول، ص: ۳۸۴

اور دوسری مرتبہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے دور میں۔"[۲۲]

دور حاضر کے نامور محدث علامہ احمد سعید کاظمی سیرت حلبیہ کی اس عبارت کو نقل فرمانے کے بعد لکھتے ہیں: "ہمارے نزدیک بھی یہی اصح اور لائق اعتماد ہے۔"[۲۳]

اس صدی کے نامور مفسر اور سیرت نگار پیر محمد کرم شاہ الازہری اپنی سیرت کی کتاب ضیاء النبی میں علامہ ابن کثیر سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی تحقیق ان الفاظ میں رقم فرماتے ہیں:

"بعض روایات میں ہے کہ کعبہ کی تعمیر سب سے پہلے آدم علیہ السلام نے کی لیکن ان روایات کے بارے میں علامہ ابن کثیر کی تحقیق یہ ہے کہ یہ روایات صحیح نہیں انہوں نے اپنے موقف کو ثابت کرنے کیلئے قرآن وسنت سے استدلال کیا ہے۔

(یہاں پیر صاحب نے علامہ ابن کثیر کی "السیرۃ النبویة" جلد اوّل صفحہ ۲۷۱ سے ایک اقتباس نقل کیا ہے۔ اقتباس نقل کرنے کے بعد اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں): صحیح حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔

"حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے پہلے کون سی مسجد بنائی گئی۔

فرمایا: مسجد حرام، پھر عرض کی اس کے بعد۔

فرمایا: مسجد اقصی۔ پھر پوچھا ان کے درمیان کتنا عرصہ گذرا۔

فرمایا: چالیس سال۔[۲۴]

---

(۲۲) سیرت حلبیہ جلد اول ص:۲۷۹-۲۸۰ (۲۳) التبیان جلد اول، ص:۳۳۳

(۲۴) اگرچہ پیر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ضیاء القرآن میں عام روایات کے مطابق یہی تحریر کیا تھا کہ کعبہ آدم علیہ السلام نے تعمیر کیا (ضیاء القرآن جلد اول ص:۲۵۴) لیکن ضیاء النبی بعد کی تصنیف ہے۔ (ضیاء النبی جلد دوم ص:۱۴۶-۱۴۷)

حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے لکھا ہے:

مگر قرآن کریم نے بیت اللہ کی تعمیر کا معاملہ حضرت ابراھیم علیہ السلام سے شروع کیا اور اس سے پہلی حالت کا کوئی تذکرہ نہیں۔[۲۵]

حسین عاتق الغربی نے اپنے مضمون "الکعبة المشرفة اول بیت وضع للناس" میں یہی تحقیق کی ہے۔[۲۶]

امام ابن اسحاق کی ایک روایت میں یہی ہے کہ کعبہ سب سے پہلے حضرت ابراھیم علیہ السلام نے تعمیر کیا۔[۲۷] سر سید احمد خاں نے بھی تعمیر کعبہ کی ابتداء حضرت ابراھیم علیہ السلام سے ثابت کی ہے۔[۲۸] رشید رضا مصری نے ان روایات کے تعارض وتناقص، عدم صحت اور ظاہر قرآن کی مخالف ہونے کی وجہ سے ان کا انکار کیا ہے۔ وہ انہیں اسرائیلی خرافات قرار دیتے ہیں جو مسلمانوں میں یہودیوں کی وجہ سے مشہور ہوگئیں۔[۲۹] وہ ان کے ذکر کیلئے وقت ضائع کرنا بھی مناسب نہیں سمجھتے۔[۳۰] احمد عبدالرحمٰن البنا نے بھی کعبہ کی تعمیر کے بارہ میں معروف قصوں کو باطل قرار دیا ہے۔[۳۱] عبدالوہاب النجار نے بھی تعمیر کعبہ کا ذکر حضرت ابراھیم علیہ السلام کے حوالہ سے کیا ہے۔[۳۲]

---

(۲۵) قصص القرآن جلد اول ص: ۲۴۰

(۲۶) مجلة الحج جون جولائی ۲۰۰۱ء ص: ۳۴

(۲۷) الروض الانف جلد اول ص: ۱۲۸

(۲۸) الخطبات الاحمدیه ص: ۳۱۹-۳۳۱

(۲۹) تفسیر المنار جلد اول ص: ۴۶۶-۴۶۷

(۳۰) تفسیر المنار جلد ۴، ص: ۷

(۳۱) الفتح الربانی جلد ۲۰، ص: ۵۸

(۳۲) قصص الانبیاء از عبدالوہاب النجار ص: ۱۳۹-۱۴۰

قاضی سلمان منصور پوری کی بھی یہی تحقیق معلوم ہوتی ہے۔[۳۳]

محققین کی تصریحات کے بعد یہ واضح ہوجاتا ہے کہ کعبہ کے معمار اول حضرت سیدنا ابراھیم علیہ السلام ہیں۔ البتہ اس حوالہ سے چند اشکالات ہیں ان کا ازالہ ضروری ہے۔

ا۔ سورۃ ابراھیم کی آیت ۳۷ سے محمد متولی الشعراوی (تفسیر الشعراوی جلد ۳، ص: ۱۶۳۲) نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ کعبہ حضرت ابراھیم علیہ السلام سے قبل موجود تھا کیونکہ حضرت سیدنا ابراھیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام دونوں تعمیر میں شریک تھے۔ آیت ۳۷ کا ترجمہ یہ ہے: "اے ہمارے رب! میں نے بسا دیا ہے اپنی کچھ اولاد کو اس وادی میں جس میں کوئی کھیتی باڑی نہیں، تیرے حرمت والے گھر کے پڑوس میں، اے ہمارے رب! یہ اس لئے تاکہ وہ قائم کریں نماز پس کر دے لوگوں کے دلوں کو کہ وہ شوق و محبت سے ان کی طرف مائل ہوں اور انہیں رزق دے پھلوں کا تاکہ وہ تیرا شکر ادا کریں۔"

یہ دعاء ابراھیم علیہ السلام نے کب کی؟

علامہ اسماعیل حقی لکھتے ہیں کہ علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ یہ دعاء تعمیر کعبہ سے پہلے مانگی گئی یا بعد میں۔ انہوں نے دوسرے قول کی تائید میں قرآن کریم کے ان اشاروں سے استدلال کیا:

ا۔ رب اجعل هذا البلد فرماتے ہیں کہ ظاہر ہے کہ اشارہ حسیہ ہے

ب۔ عندبیتک المحرم.

ج۔ الحمد لله الذی وهب لی علی الکبر اسماعیل و اسحاق.

اور حضرت اسحاق تعمیر کعبہ سے پہلے موجود نہ تھے۔[۳۴]

---

(۳۳) رحمۃ للعالمین جلد اول، ص: ۳۸ (۳۴) روح البیان جلد ۴، ص: ۴۲۸

امام رازی لکھتے ہیں کہ یہ دعاء آخری زمانہ میں کی گئی۔[۳۵]

علامہ ابن کثیر کی رائے بھی یہ ہے کہ حضرت ابراھیم علیہ السلام نے یہ دعاء کعبہ کی تعمیر کے بعد کی کیونکہ اسماعیل علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام سے عمر میں ۱۳ سال بڑے تھے۔[۳۶]

علامہ الواحدی لکھتے ہیں کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ولادت کے وقت سیدنا ابراھیم علیہ السلام ۹۹ (۸۶؟) سال کے تھے اور جب حضرت اسحاق پیدا ہوئے اس وقت آپ کی عمر ۱۱۲ (۹۹؟) سال تھی۔[۳۷]

پس یہ دعاء تعمیر کعبہ کے ایک عرصہ بعد کی گئی کیونکہ دعاء میں حضرت اسحاق علیہ السلام کا بھی ذکر ہے حالانکہ جس وقت حضرت ابراھیم علیہ السلام نے ہاجر[۳۸] ام اسماعیل کو مکہ میں چھوڑا اس وقت حضرت اسحاق کی ولادت ہی نہ ہوئی تھی۔

۲۔ اس حوالہ سے دوسرا اہم اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ سورہ آل عمران میں ہے: ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ مبارکا وھدی للعلمین.

اس آیت میں اول بیت کا ذکر ہے، للناس اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جب سے انسان ہیں اس وقت سے کعبہ ہے اور پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام ہیں اس لئے اسکا وجود آدم علیہ السلام سے پہلے ضروری ہے اور تیسری بات یہ کہ وُضع کا فاعل معلوم نہیں وہ فرشتے ہیں کیونکہ

---

(۳۵) مفاتیح الغیب جلد ۷، ص: ۱۰۶

(۳۶) تفسیر القرآن العظیم جلد ۲، ص: ۵۴۰

(۳۷) الوسیط فی تفسیر القران المجید جلد ۳، ص: ۳۴

علاوہ ازیں البغوی جلد سوم ص: ۳۸/ زاد المسیر جلد ۴، ص: ۳۶۸/ فتح القدیر جلد سوم، ص: ۱۱۳

(۳۸) اردو میں ہاجرہ ہے لیکن عربی میں ہاجر ہی ہے

کیونکہ فرشتے بھی عالمین میں شامل ہیں۔۳۹

علامہ متولی الشعراوی نے اس آیت سے جو نتائج اخذ کئے ہیں وہ آیت کے شان نزول سے مطابقت نہیں رکھتے۔ یہ آیت یہودیوں کے اس اعتراض کے جواب میں نازل ہوئی کہ تم نے بیت المقدس کو چھوڑ کر کعبہ کو قبلہ کیوں بنایا۔

اس سلسلہ میں تفسیر نمونہ کے مؤلفین، جو کعبہ کی تعمیر حضرت ابراھیم سے قبل ثابت کرتے ہیں۔۴۰ وہ لکھتے ہیں: "یہودیوں کے پیغمبر اسلام ﷺ پر دو اعتراض تھے۔ دوسرا اعتراض ان کا یہ تھا کہ بیت المقدس کو خانہ کعبہ پر برتری حاصل ہے۔ اس کا جواب مندرجہ بالا آیات میں دیا جا رہا ہے۔ آیت بتلا رہی ہے کہ اگر کعبہ کو مسلمانوں کے قبلہ کی حیثیت سے منتخب کیا گیا ہے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ چونکہ روئے زمین پر وجود میں آنے والا یہ خدا کا پہلا گھر اور پہلی عبادت گاہ ہے۔"۴۱

مولانا مودودی لکھتے ہیں: "یہودیوں کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ تم نے بیت المقدس کو چھوڑ کر قبلہ کیوں بنایا ہے، حالانکہ پچھلے انبیاء کا قبلہ بیت المقدس ہی تھا۔ اسکا جواب سورہ بقرہ میں دیا جا چکا ہے لیکن یہودی اس کے بعد بھی اپنے اعتراض پر مصر رہے لہٰذا یہاں پھر اسکا جواب دیا گیا ہے۔

بیت المقدس کے متعلق خود بائبل ہی کی شہادت موجود ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساڑھے چار سو برس بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کو تعمیر کیا۔ (۱-سلاطین باب ۵ آیت ۱)

---

(۳۹) تفسیر الشعراوی جلد سوم، ص: ۱۶۳۰-۱۶۳۱

(۴۰) تفسیر نمونہ جلد اول، ص: ۳۳۰-۳۳۱/ جلد دوم، ص: ۲۰۲

(۴۱) تفسیر نمونہ جلد دوم ص: ۲۰۲

اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں قبلہ اہل توحید قرار دیا گیا۔ (کتاب مذکور، باب ۸، آیت ۲۹-۳۰) برعکس اسکے یہ تمام عرب کی متواتر اور متفق علیہ روایات سے ثابت ہے کہ کعبہ کو حضرت ابراھیم علیہ السلام نے تعمیر کیا اور وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے آٹھ نو سو برس پہلے گذرے ہیں لہٰذا کعبہ کی اولیت ایسی حقیقت ہے کہ جس میں کسی کلام کی گنجائش نہیں۔"[۴۲]

"للناس" سے بھی استدلال اس وجہ سے درست نہیں کہ قرآن کریم میں یہ لفظ فقط آدم علیہ السلام سے لیکر قیامت تک کے انسانوں ہی کیلئے استعمال نہیں ہوا بلکہ ایک خاص وقت کے لوگوں کیلئے بھی استعمال ہوا۔

چند مثالیں درج ذیل ہیں:

۱۔ نزّل علیک الکتب بالحقّ مصدّقا لمابین یدیہ وانزل التّورٰتہ والانجیل من قبل ھدًی للناس.[۴۳]

آپ پر یہ کتاب اس نے حق کے ساتھ نازل فرمائی، تصدیق کرنے والی ہے ان کتابوں کی جو اس سے پہلے اتری ہیں اور اس نے اس سے پہلے لوگوں کی ہدایت کیلئے تورات اور انجیل اتاری۔

اس آیت مبارکہ میں للناس سے مراد توراۃ اور انجیل کے مخاطب ہیں نہ کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر اس زمانہ تک کے لوگ۔

۲۔ ویکلّم الناس فی المھد و کھلا و من الصالحین.[۴۴]

اور گفتگو کرے گا لوگوں کے ساتھ گھوارے میں اور پکی عمر میں بھی۔

---

(۴۲) تفہیم القرآن جلد اول ص: ۲۷۴

(۴۳) آل عمران آیت ۳-۴ (۴۴) آل عمران آیت ۴۶

یہاں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی گفتگو تمام بنی نوع انسان سے مراد نہیں بلکہ خاص اس زمانہ کے لوگ مراد ہیں۔

گویا لفظ ''الناس'' کا تعین سیاق وسباق سے ہوگا اس لئے ہر جگہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ چونکہ آدم علیہ السلام انسان اول ہیں وہ بھی اس میں شامل ہیں۔

اس آیت سے قبل سیدنا ابراھیم علیہ السلام کی ملت کا ذکر تھا اس لئے ''للناس'' سے مراد بھی آپ کے زمانہ اقدس سے لیکر بعد والے لوگ ہی ہو سکتے ہیں نہ کہ آپ سے پہلے والے علاوہ ازیں تعمیر کعبہ کے حوالہ سے قرآن نے حضرت آدم علیہ السلام یا کسی اور نبی کا ذکر نہیں کیا صرف سیدنا ابراھیم علیہ السلام کا ذکر ہی کیا ہے یہ قرینہ بھی اس پر دلالت کرتا ہے کہ ''للناس'' میں انسان اول شامل نہیں۔

۳۔ واذیرفع ابراھیم القواعد من البیت واسماعیل.

اور یاد کرو جب ابراھیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام کعبہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے۔(۴۵)

اس آیت مبارکہ سے بھی استدلال کیا جاتا ہے کہ کعبہ کی بنیادیں پہلے سے موجود تھیں۔ ابراھیم واسماعیل علیہما السلام ان کو بلند کر رہے تھے۔ اس دلیل کیلئے ''یرفع'' اور ''قواعد'' کے الفاظ پر غور کرنا چاہیے۔

امام راغب ''رفع'' کے حوالہ سے لکھتے ہیں: ''اور کبھی عمارت کو کھڑا کرنے اور اوپر لے جانے کیلئے استعمال ہوتا ہے''

احمد سعید کاظمی لکھتے ہیں: قواعد قاعدۃ کی جمع ہے۔

جمہور اہل لغت نے قاعدہ کا ترجمہ اساس اور بنیاد کے الفاظ سے کیا ہے۔ کسائی نے کہا: القاعدہ۔الجدار قاعدہ دیوار کو کہتے ہیں۔''

---

(۴۵) البقرہ آیت: ۱۲۷

اس آیت مبارکہ میں ان دونوں لفظوں میں سے کوئی لفظ بھی اس بات پر قطعی دلالت نہیں کرتا کہ کعبہ کی بنیاد پہلے سے موجود تھی۔ اردو میں بھی ''دیوار بلند کرنا'' یا ''بنیاد اٹھانا'' قطعی طور پر ثابت نہیں کرتا کہ دیوار یا بنیاد پہلے سے موجود ہے۔

اسی وجہ سے علامہ احمد سعید کاظمی نے اسی آیت کی تفسیر میں لکھا: ''ابراھیم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کی تعمیر فرمائی اور اسماعیل علیہ السلام ان کے ساتھ اس خدمت میں شریک رہے۔ اتنی بات قطعی ہے جس میں کسی تردد کی گنجائش نہیں۔ قرآن مجید کی عبارت النص میں یہ مضمون وارد ہے۔[۴۶]

جن لوگوں نے اس آیت سے یہ ثابت کیا ہے کہ بیت اللہ پہلے سے موجود تھا وہ بھی اس آیت کو قطعی دلیل نہیں سمجھتے یہ قیاس ہی ہے۔ تفسیر نمونہ کے مؤلفین لکھتے ہیں:

''آیت کا یہ انداز بتاتا ہے کہ خانہ کعبہ کی بنیادیں موجود تھیں۔[۴۷]

آیت کا انداز فقط اس لئے بتاتا نظر آتا ہے کہ ہم پہلے سے طے شدہ فیصلے قرآن سے ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

۴۔ واذ بوّانا لابراھیم مکان البیت.[۴۸]

اور یاد کرو جب ہم نے مقرر کر دی، ابراھیم کیلئے اس گھر کی جگہ۔

اس آیت میں بھی بـوأ کے لفظ کے ایک خاص مفہوم کو پیش نظر رکھنے سے غلط فہمی پیدا ہوئی۔ اور وہ خاص مفہوم یہ ہے۔

اریناہ اصلہ لیبنِیہ و کان قد دَرَسَ بالطوفان.[۴۹]

یعنی کعبہ کی اصل بنیادیں جو طوفان نوح میں بوسیدہ ہوگئی تھیں دکھائی گئیں۔

---

(۴۶) التبیان جلد اول ص: ۳۳۱ (۴۷) تفسیر نمونہ جلد اول ص: ۳۳۰

(۴۸) الحج آیت ۲۶ (۴۹) الجامع لاحکام القرآن جلد ۱۲، ص: ۲۵

بوأ کا لفظ قرآن میں متعدد مقام پر استعمال ہوا ہے۔ اس کے مفہوم میں دو باتیں پائی جاتی ہیں۔

۱۔ رجوع الی الشی.

۲۔ برابر ہونا۔

اور اس لفظ کا استعمال اس وقت ہوتا ہے جب کسی رہائشی مقام کی فضا اور ماحول رہنے والے کی طبیعت کے موافق اور سازگار ہو یا کوئی شخص
جس مقصد کیلئے کسی رہائشی جگہ کا انتخاب کرتا ہے وہ اس کیلئے موافق اور سازگار ہو۔ ۵۰

پس یہ آیت حضرت ابراهیم علیہ السلام کیلئے کعبہ کی جگہ کا تعین تو کرتی ہے لیکن اس بات کیلئے قطعی نہیں کہ بنیادیں پہلے سے موجود تھیں اور ان کو واضح کر دیا گیا۔

پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"حضرت خلیل علیہ السلام کو جب تعمیر کعبہ کا حکم ملا تو اب انہیں یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ کونسی وہ مخصوص جگہ ہے جہاں اللہ تعالیٰ کا یہ گھر تعمیر کیا جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس مخصوص جگہ پر مطلع فرما دیا اور آپ اپنے فرزند ارجمند اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ تعمیر کعبہ میں مشغول ہو گئے۔ ۵۱

علمائے محققین کی درج بالا تحقیقات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابراهیم علیہ السلام سے قبل کعبہ کی تعمیر کے سلسلہ میں کوئی قطعی آیت یا صحیح حدیث نہیں ہے البتہ ابراهیم علیہ السلام کی تعمیر نصوص قطعیہ سے ثابت ہے۔

---

(۵۰) مترادفات القرآن ص: ۶۷

(۵۱) ضیاء القرآن جلد سوم ص: ۲۱۰

حضرت داؤد علیہ السلام اور دنبیوں کا قصہ

قرآن کریم کے اعجاز میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے انبیاء کی عصمت و پاکدامنی کو بیان کیا بخلاف انجیل کے۔ ایف ایس خیر اللہ نے قاموس الکتاب میں حضرت داؤد علیہ السلام کے بارہ میں لکھا "لیکن ان تمام باتوں کے باوجود داؤد سے بہت سے گناہ بھی سرزد ہوئے" ایک قصہ جو بائبل سے ہماری کتب میں آیا بائبل کی روشنی میں درج ذیل ہے:

"اور شام کے وقت داؤد اپنے پلنگ پر سے اُٹھ کر بادشاہی محل کی چھت پر ٹہلنے لگا اور چھت پر سے اس نے ایک عورت کو دیکھا جو نہا رہی تھی اور وہ نہایت خوبصورت تھی تب داؤد نے لوگ بھیج کر اس عورت کا حال دریافت کیا اور کسی نے کہا کیا وہ العام کی بیٹی بت سبع نہیں جو حتّی اوریاہ کی بیوی ہے؟ اور داؤد نے لوگ بھیج کر اسے بلا لیا وہ اس کے پاس آئی اور اس نے اس سے صُحبت کی پھر وہ اپنے گھر کو چلی گئی اور وہ عورت حاملہ ہوگئی۔ سو اس نے داؤد کے پاس خبر بھیجی کہ میں حاملہ ہوں" [1]

"صبح کو داؤد نے یوآب کے لیے ایک خط لکھا اور اسے اوریاہ کے ہاتھ بھیجا اور اس نے اس خط میں لکھا کہ اوریاہ کو گھمسان میں سب سے آگے رکھنا اور تم اس کے پاس سے ہٹ جانا تا کہ وہ مارا جائے اور جان بحق ہو اور یوں ہوا کہ جب یوآب نے اس شہر کا ملاحظہ کر لیا تو اس نے اوریاہ کو ایسی جگہ رکھا جہاں وہ جانتا تھا کہ بہادر مرد ہیں اور اس شہر کے لوگ نکلے اور یوآب سے

---

(۱) سیموئیل کا باب ۱۲ آیات ۲ تا ۵

لڑے اور وہاں داؤد کے خادموں میں سے تھوڑے سے لوگ کام آئے اور حتّی اوریاہ بھی مرگیا''۔[۲]

اس مشہور قصہ کا یہ حصہ بھی ہے:

''خداوند نے ناتن کو داؤد کے پاس بھیجا اس نے اسکے پاس آکر اس سے کہا کہ کسی شہر میں دو شخص تھے ایک امیر اور دوسرا غریب۔ اس امیر کے پاس بہت سے ریوڑ اور گلے تھے پر اس غریب کے پاس بھیڑ کی ایک پٹھیا کے سوا کچھ نہ تھا جسے اس نے خرید کر پالا تھا اور اس امیر کے ہاں کوئی مسافر آیا سو اس نے اس مسافر کیلئے جو اس کے ہاں آیا تھا پکانے کو اپنے ریوڑ اور گلے سے کچھ نہ لیا بلکہ اس غریب کی بھیڑ لے لی اور اس شخص کیلئے جو اس کے ہاں آیا تھا پکائی۔

تب داؤد کا غضب اس شخص پر بشدت بھڑکا اور اس نے ناتن سے کہا کہ خداوند کی حیات کی قسم وہ شخص جس نے یہ کام کیا واجب القتل ہے۔ اس شخص کو اس بھیڑ کا چوگنا بھرنا پڑے گا کیونکہ اس نے ایسا کام کیا اور اسے ترس نہ آیا۔ تب ناتن نے داؤد سے کہا وہ شخص تو ہی ہے۔ تو نے حتّی اوریاہ کو تلوار سے مارا اور اسکی بیوی لے لی تا کہ وہ تیری بیوی بنے اور اسکو بنی عمون کی تلوار سے قتل کروایا۔[۳]

ہمارے بعض مفسرین نے اس واقعہ کو اپنی کتابوں میں یہودیوں سے سن کر نقل کیا۔[۴] لیکن محققین نے اس کے باطل ہونے پر مختلف پہلوؤں سے بحث کی۔ امام رازی لکھتے ہیں:

''یہاں ایک افسانہ بیان کیا جاتا ہے بعض لوگوں نے اسے اس طرح بیان کیا کہ گناہ کبیرہ کی نسبت اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر بندے کی طرف ہوتی ہے۔ بعض نے اس قصہ کو اس طرح بیان کیا کہ گناہ صغیرہ کی نسبت ہوتی ہے۔ میرا عقیدہ اور تحقیق ہے کہ واقعہ باطل اور لغو ہے''۔

اس واقعہ کے بطلان پر دلائل پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

(۲) آیت ۱۴ تا ۱۷ (۳) ۲-سموئیل باب ۱۲۔ فقرات ۱ تا ۱۱

(۴) معالم التنزیل جلد ۴، ص: ۵۴

"اگر ایسی حرکت فاسق ترین آدمی کی طرف بھی منسوب کی جائے تو وہ بھی اسکو برداشت نہیں کرے گا اور جس بد بخت نے ایسی فحش بات اللہ تعالیٰ کے نبی کی طرف منسوب کی ہے اگر خود اس پر ایسا الزام لگایا جائے تو وہ اپنی خباثت طبع کے باوجود اسکی پرزور تردید کرے گا اور بہتان لگانے والے پر لعنت بھیجے گا ایسا گھناؤنا جرم جسے ایک ادنی درجہ کا امتی اپنے لئے پسند نہیں کرتا ایک نبی کا دامن عصمت اس سے کب آلودہ ہوسکتا ہے نیز اگر قصے کو صحیح تسلیم کرلیا جائے تو حضرت داؤد پر دو سنگین جرم ثابت ہوں گے ایک قتل بے گناہ، دوسرا فعل قبیح۔

قرآن میں یہ آیات اس لئے نازل کی گئیں تاکہ نبی کریم ﷺ کی دلجوئی ہو اور حضرت داؤد علیہ السلام کے اسوۂ حسنہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے وہ کفار کی دلآزاری سے کبیدہ خاطر نہ ہوں۔ اگر حضرت داؤد سے یہ حرکت سرزد ہوئی ہوتی تو اللہ تعالیٰ ایسے شخص کے ذکر سے اپنے محبوب کی دلجوئی نہ فرماتا جو اپنی خواہش نفس کے سامنے بے بس ہے اور قتل بے گناہ کے ارتکاب کی جرأت کرتا ہے نیز گذشتہ آیات میں حضرت داؤد کو جن صفات عالیہ سے موصوف فرمایا گیا ہے وہ یہ ہیں:

عبدنا، ذالاید، اواب، صاحب، فصل الخطاب

اگر آپ سے ایسی ناگوار حرکت سرزد ہوتی تو پھر آپ کو ان اوصاف جمیلہ سے متصف کرنے کا کوئی مقصد نہ رہتا اور آپ کو عندنا لزلفی اور حسن مآب کی بشارت نہ دی جاتی اس لئے آیات کا سیاق وسباق بھی اس قصہ کی تردید کرتے ہیں۔ ۵

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ آپ فرماتے:

من حدثكم بحديث داؤد على مايرويه القصاص جلدته مائة وستين. ٦

جوتم سے داؤد علیہ السلام کا واقعہ بیان کرے جیسا کہ قصہ گو بیان کرتے ہیں اسے ۱۶۰ کوڑے ماروں

(۵) مفاتیح الغیب جلد ۲۶، ص: ۱۸۹ (۶) مفاتیح الغیب جلد ۲۶، ص: ۱۹۲

سید علی نقی النقوی اس قصہ کے بارہ میں لکھتے ہیں: ''اسرائیلیات کے اثر سے مسلمانوں کی کتب میں بھی یہ تذکرہ آ گیا ہے مگر روایات کا قرآن کے مقابلہ میں کیا اعتبار؟ اور قران مجید میں اسکی جتنی اصلیت ہے وہ پیش کردی گئی ہے اور وہ ایسی ہے جس سے کسی ایسے فعل کا صدور جو خلاف قانون اور خلاف شرع ہو جناب داؤد علیہ السلام سے ظاہر نہیں ہوتا''۔ ے

ابو حیان اندلسی لکھتے ہیں:

''ہمارا یقین کامل ہے کہ انبیاء علیہم السلام گناہوں اور خطاؤں سے معصوم ہوتے ہیں ایسے امور ان سے کبھی بھی سرزد نہیں ہو سکتے۔ اگر ایسا ہوتا تو شرعی احکام پر اعتماد باقی نہ رہتا اور انبیاء کرام کے ارشادات پر اعتماد نہ رہتا۔ قصہ گو لوگوں نے منصب نبوت کے منافی جو افسانے وضع کر لئے ہیں ان کو ہم ردی کی ٹوکری میں پھینکتے ہیں۔ ہمارا مسلک تو وہ ہے جو شاعر نے اس شعر میں بیان کیا ہے:

ونؤثر حکم العقل فی کل شبهه

اذا آثر الاخبار جُلّاس قصاص

شک ہو تو ہم عقل کا حکم مانتے ہیں لیکن قصہ گو لوگوں کے پاس بیٹھنے والے کہانیوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ ۸

الحافظ عماد الدین ابو الفد اسماعیل بن کثیر لکھتے ہیں: قد ذکر المفسرون ههنا قصة اکثرها ماخوذ من الاسرائیلیات ولم یثبت فیها عن المعصوم حدیث یجب اتباعه ولکن روی ابن ابی حاتم هنا حدیثا لایصح سنده لانه من روایة یزید الرقاشی

(۷) فصل الخطاب جلد ۶، ص: ۳۲۵

(۸) البحر المحیط جلد ۷، ص: ۳۹۳

عن انس ﷺ ویزیدو ان کان من الصالحین لکنه ضعیف الحدیث عند الآئمه فالاولی أن یقتصر علی مجرد تلاوة هذه القصة وأن یرد علمها الی اللّٰه عزوجل.۹

مفسرین نے یہاں جو قصہ نقل کیا وہ اکثر اسرائیلیات میں سے ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ صحیح ثابت نہیں کہ اسکو مانا جائے۔ ابن ابی حاتم نے حضرت انس سے مروی جو روایت نقل کی اس میں یزید الرقاشی ہے اگرچہ یزید نیک لوگوں سے ہے لیکن آئمہ حدیث نے اسے ضعیف قرار دیا۔۱۰ بہتر یہی ہے کہ ہم صرف اس قصہ کی تلاوت پر اکتفا کریں اور اسکی حقیقت کو اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹا دیں۔

قاضی عیاض لکھتے ہیں:

''مورخین نے اہل کتاب سے سن کر جو لکھا وہ قابل توجہ نہیں کیونکہ اسے تبدیل کیا گیا ہے اسے بعض مفسرین نے نقل کیا لیکن قرآن میں اسکا کوئی ثبوت نہیں اور نہ ہی حدیث صحیح میں اس بارہ میں کچھ ہے''۔۱۱

امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''رہے وہ مُزخرف قصے جو تفسیر کی بعض کتابوں میں نقل ہوئے ہیں تو ان کی نسبت ہماری دعاء یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو معاف فرمائے جو اپنی کتابوں میں ان کو نقل کرنے کے

(۹) جلد۴،ص:۴۱

(۱۰) نسائی اور حاکم نے اسے متروک الحدیث قرار دیا، ابن معین کہتے ہیں ولیس حدیثه بشئ، ملاحظہ فرمائیے ابن حجر عسقلانی کی تہذیب التہذیب جلد۱۱،ص:۳۰۹-۳۱۱

(۱۱) تفسیر خازن جلد۶،ص:۴۱

مرتکب ہوئے ہیں"۔ ۱۲

علامہ صابونی ۱۳، پیر محمد کرم شاہ ۱۴، عبدالماجد دریا آبادی ۱۵، علامہ طبرسی ۱۶، مؤلفین تفسیر نمونہ ۱۷، امام نسفی ۱۸ مفتی محمد شفیع ۱۹ اور دیگر مفسرین نے اس خرافاتی قصہ کا رد کیا ہے۔

---

(۱۲) تدبر قرآن جلد ۶، ص: ۵۲۶ (۱۳) صفوۃ التفاسیر جلد ۳، ص: ۵۵

(۱۴) ضیاء القرآن جلد ۴، ص:...... (۱۵) جلد ۲، ص: ۹۱۰

(۱۶) مجمع البیان جلد ۸، ص: ۴۷۲ (۱۷) جلد ۱۹، ص: ۲۱۷-۲۱۹

(۱۸) مدارک التنزیل وحقائق التاویل جلد ۴، ص: ۲۹

(۱۹) معارف القرآن جلد ہفتم ص: ۵۰۰

سیدنا موسیٰ علیہ السلام اور زبان کی لکنت

سورۂ طٰہ کی آیت واحلل عقدۃ من لسانی.[1]

کی تفسیر میں مفسرین نے لکھا ہے کہ آپ کی زبان میں لکنت تھی اور آپ نے اسی کے دور کرنے کیلئے دعاء مانگی۔[2]

مولانا مودودی اس واقعہ کے اسرائیلی اور باطل ہونے کے بارہ میں لکھتے ہیں:

''بائبل میں اسکی جو تشریح ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ نے عرض کیا: اے خداوند میں فصیح نہیں ہوں نہ پہلے ہی تھا اور نہ جب سے تو نے اپنے بندے سے کلام کیا، بلکہ رک رک کر بولتا ہوں اور میری زبان کند ہے۔ (خروج ۴: ۱۰) مگر تالمود میں اسکا ایک لمبا چوڑا قصہ بیان ہوا ہے۔ اس میں یہ ذکر ہے کہ بچپن میں جب حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے گھر پرورش پا رہے تھے، ایک روز انہوں نے فرعون کے سر کا تاج اتار کر اپنے سر پر رکھ لیا۔ اس پر یہ سوال پیدا ہوا کہ اس بچے نے یہ کام بالارادہ کیا ہے یا یہ محض طفلانہ فعل ہے۔ آخر کار یہ تجویز کیا گیا کہ بچے کے سامنے سونا اور آگ دونوں ساتھ رکھے جائیں چنانچہ دونون چیزیں لاکر سامنے رکھی گئیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آگ اٹھا کر منہ میں رکھ لی۔ اس طرح ان کی جان تو بچ گئی مگر زبان میں ہمیشہ کیلئے لکنت پڑ گئی۔

---

(۱) آیت: ۲۷ (۲) معالم التنزیل جلد ۳، ص: ۲۱۶

ضیاء القرآن جلد ۳، ص: ۱۰۹/ مظہری جلد ۷، ص: ۳۷۶۔ تفسیر عثمانی ص: ۴۰۶

یہی قصہ اسرائیلی روایات سے منتقل ہو کر ہمارے ہاں کی تفسیروں میں بھی رواج پا گیا۔
لیکن عقل اسے ماننے سے انکار کرتی ہے اس لئے کہ اگر بچے نے آگ پر ہاتھ مارا بھی ہو تو یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ وہ انگارے کو اٹھا کر منہ میں لے جا سکے بچہ تو آگ کی جلن محسوس کرتے ہی ہاتھ کھینچ لیتا ہے۔منہ میں لے جانے کی نوبت ہی کہاں آ سکتی ہے؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فصاحت کیلئے حضرت ہارون علیہ السلام کو مانگا اور وجہ یہ بیان کی ہوا فصح منی لسانا. کہ میرا بھائی مجھ سے زیادہ فصیح ہے۔

پس ”واحلل عقدة من لسانی یفقھوا قولی“ کے الفاظ میں بھی جس بات کی درخواست ہے وہ لکنت دور کرنے کی نہیں بلکہ جیسا کہ ہم نے عرض کیا اظہار و بیان کی وہ صلاحیت بخشے جانے کی درخواست ہے جو فریضۂ رسالت و نبوت کی ادائیگی کیلئے ضروری تھی۔“

یہ بھی پیش نظر رہے کہ ”رسول ہمیشہ شکل وصورت، شخصیت اور صلاحیتوں کے اعتبار سے بہترین لوگ ہوئے ہیں جن کے ظاہر و باطن کا ہر پہلو دلوں اور نگاہوں کو متاثر کرنے والا ہوتا ہے۔کوئی رسول ایسے عیب کے ساتھ نہیں بھیجا گیا اور نہیں بھیجا جا سکتا تھا جس کی بنا پر وہ لوگوں میں مضحکہ بن جائے یا حقارت کی نظر سے دیکھا جائے۔“

علامہ محمد بن احمد السفارینی لکھتے ہیں: نبوت کی شرائط میں سے یہ ہے کہ نبی ہر اس چیز سے سلامت ہو جس سے لوگ متنفر ہوں جیسے ماں باپ کی بدکاری اور ایسے عیوب جن سے لوگ نفرت کرتے ہوں جیسے برص اور جذام وغیرہ۔

محل تعمیر کرنے کا فرعونی حکم

فاجعل لی صرحالعلی اطلع الی الہ موسیٰ[1]

(اے ہامان!) میرے لئے ایک اونچا محل تعمیر کر شاید (اس پر چڑھ کر) میں موسیٰ کے الہ کا سراغ لگا سکوں۔

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے لکھا کہ فرعون نے ایک اونچا مینار تعمیر کروایا پھر وہ اوپر چڑھا اور ایک تیرانداز کو آسمان کی طرف تیر چلانے کا حکم دیا۔ تیراندازوں نے اوپر کو تیر پھینکے تیر خون آلود ہو کر واپس آئے۔ فرعون بولا میں نے موسیٰ کے خدا کو قتل کر دیا۔

جبرئیل علیہ السلام نے اس عمارت کو پر مار کر تین ٹکڑے کر دیا، ایک ٹکڑا فرعون کے لشکر پر گرا جس سے لاکھوں آدمی مر گئے، ایک ٹکڑا سمندر میں جا گرا اور ایک ٹکڑا مغرب میں جا گرا۔ جن لوگوں نے عمارت بنوانے میں تعاون کیا وہ بھی ہلاک ہو گئے۔[2]

اس قصہ کا رد کرتے ہوئے امام رازی لکھتے ہیں: ''اس بات کو تو پاگل اور مجنون بھی تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں۔ قرآن کریم کے قصوں کی ایسی تشریح جو بدیہ البطلان ہو اسکی اجازت نہ عقل دیتی ہے اور نہ دین اسے برداشت کرتا ہے۔

(۱) سورۃ القصص آیت: ۳۸

(۲) معالم التنزیل جلد ۳، ص: ۴۴۶/ تفسیر مظہری جلد ۹، ص: ۱۲۲-۱۲۱/ تفسیر حسنات جلد ۴

اس طرح تو ہم ان لوگوں کیلئے راہ ہموار کردیں گے جو قرآن پر اعتراض کرنے کیلئے ایسے زریں موقعوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔[3]

امام قرطبی کے الفاظ بھی ظاہر کرتے ہیں کہ اسے وہ باطل سمجھتے ہیں۔ **فحکی السدی** سے اس قصہ کا آغاز کرتے ہیں اور آخر **واللّٰـہ اعلم بصحۃ ذلک**[4] لکھتے ہیں۔ اسی طرح زمخشری نے **واللہ اعلم بصحتہ**[5] کہہ کر اس قصہ کے مردود ہونے کی طرف اشارہ کیا۔

تفسیر نمونہ میں ہے: "یہ مؤرخین کا طبع زاد افسانہ ہے۔ موجودہ قاہرہ کے جنوب میں فرعون کے دارالسلطنت کے کھنڈرات موجود ہیں وہاں اس قسم کی عمارت کا کوئی نشان نہیں۔ مفسرین نے یہ بھی لکھا کہ یہ عمارت دیر تک قائم نہیں رہی تباہ ہوگئی بہت سے لوگ اس کے نیچے دب کر مر گئے اس سلسلہ میں اہل قلم نے اور بھی طرح طرح کی داستانیں لکھی ہیں لیکن ان کی صحت کی تحقیق نہ ہوسکی۔"[6]

---

(۳) مفاتیح الغیب جز۲۴، ص:۲۵۳/ ضیاء القرآن جلد ۳، ص:۴۹۲

(۴) جز۱۳، ص:۲۸۹ (۵) جلد ۳، ص:۴۱۳

(۶) تفسیر نمونہ جلد ۱۶، ص:۹۱-۹۲

حضرت ایوب علیہ السلام کے جسم اطہر میں کیڑوں کا افسانہ

حضرت ایوب علیہ السلام کے بارہ میں بیان کیا جاتا ہے کہ آپ کے جسم اطہر کو کیڑوں نے کھالیا تھا صرف پسلیاں اور رگیں باقی رہ گئیں۔[1]

علامہ غلام رسول سعیدی اس روایت کا رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حضرت ایوب علیہ السلام کے جسم میں کیڑے پڑنے کا واقعہ حافظ ابن عساکر اور حافظ ابن کثیر دونوں نے بنی اسرائیل کے علماء سے نقل کیا ہے اور ان کی اتباع میں مفسرین نے بھی ذکر کیا لیکن ہمارے نزدیک یہ واقعہ صحیح نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ انبیاء علیھم السلام کو ایسے حال میں مبتلا نہیں کرتا جس سے لوگوں کو نفرت ہو اور وہ ان سے گھن کھائیں۔

اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیھم السلام کے متعلق فرمایا: **انھم عندنالمن المصطفین الاخیار** یہ ہمارے پسندیدہ اور نیک لوگ ہیں۔

حضرت ایوب علیہ السلام پر کوئی سخت بیماری مسلط کی گئی تھی لیکن وہ بیماری ایسی نہیں تھی جس سے لوگ گھن کھائیں۔ حدیث صحیح مرفوع میں بھی اس قسم کی کسی چیز کا ذکر نہیں، صرف ان کی اولاد اور ان کے مال مویشی کے مرجانے اور ان کے بیمار ہونے پر صبر کا ذکر ہے۔ علماء اور واعظین کو چاہیے کہ وہ حضرت ایوب علیہ السلام کی طرف ایسے احوال منسوب نہ کریں جن سے لوگوں کو گھن آئے۔[2]

---

(۱) روح المعانی جلد ۹، ص: ۷۷،

ابن کثیر جلد ۳ ص: ۱۸۸، مختصر تاریخ دمشق جلد ۵، ص: ۱۰۷، تبیان القرآن جلد ۷، ص: ۶۴۹

(۲) تبیان القرآن جلد ۷، ص: ۶۴۹

• دلیل عقلی بھی اس مطلب پر دلالت کرتی ہے کیونکہ اگر پیغمبر میں کوئی نفرت انگیز حالت یا صفت ہوگی تو یہ بات انکی رسالت کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہوسکتی۔ پیغمبر کو تو ایسا ہونا چاہیے کہ تمام لوگ اس سے میل ملاپ رکھیں اور کلمات حق کو ان سے سن سکیں۔ پیغمبر میں ہمیشہ قوت جذب وکشش ہوتی ہے۔(۳)

محمد باقر مجلسی نے لکھا ہے کہ آپ کے جسم اقدس میں نہ ہی کوئی بد بو پیدا ہوئی اور نہ ہی کوئی قابل نفرت چیز خارج ہوئی۔(۴)

علامہ شبیر احمد عثمانی نے بھی اس قصہ کا رد کیا ہے۔(۵)

(۳) تفسیر نمونہ جلد ۱۳، ص: ۳۵۵

(۴) بحار الانوار جلد ۴۴، ص: ۲۷۵

(۵) حاشیہ سورہ ص

عوج بن عنق (عوق)

مفسرین نے اِنَّ فیھا قوماً جَبَّارِیْن [1] کے تحت قوم عمالقہ [2] کے بارہ میں محیر العقول واقعات بیان کئے ہیں۔ یہ واقعات ان کے قد و قامت، جسامت، اور ان کی غیر معمولی جسمانی قوت کے بارہ میں ہیں۔ اسی قوم میں سے ایک عوج بن عنق ہے اسکے بارہ میں دیومالائی قصے معروف ہیں۔ [3] جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے بارہ افراد تحقیق احوال کیلئے بھیجے تو انہوں نے واپس آ کر قوم عمالقہ کی جو تصویر کشی کی وہی ہماری کتب تفسیر میں درج روایات کا بنیادی ماخذ ہے:

(۱) جَبَّار اصل میں مادہ جبر سے ہے اسکا معنی کسی چیز کی قوت سے اور زبردستی اصلاح کرنا۔ اسی لئے ٹوٹی ہوئی ہڈی باندھنے کو "جبر" کہتے ہیں۔ بعد ازاں ایک طرف ہر طرح کی اصلاح اور دوسری طرف ہر طرح کے تسلط اور غلبہ کے مفہوم میں استعمال ہونے لگا۔ خدا تعالیٰ کو بھی جبار اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ تمام چیزوں پر تسلط رکھتا ہے۔

(۲) عمالقہ سام کی اولاد میں سے ایک قوم تھی یہ جزیرہ نمائے عرب کے شمال میں صحرائے سینا کے نزدیک رہتے تھے اور مصر پر حملہ آور ہوئے اور مدتوں اس پر قابض رہے۔ انکی حکومت کا عرصہ تقریباً ۵۰۰ سال تھا ۲۲۱۳ ق م سے ۱۷۰۲ ق م

(۳) الدر المنثور جلد ۲، ص: ۲۷۰

جامع البیان جلد ۶، ص: ۲۳۷-۲۳۸ / الجامع الاحکام القران جلد ۶، ص: ۱۲۵

''وہ ملک جس کا حال دریافت کرنے کو ہم اس میں سے گذرے ایک ایسا ملک ہے جو اپنے باشندوں (حملہ آوروں) کو کھا جاتا ہے اور وہاں جتنے آدمی ہم نے دیکھے وہ سب قد آور ہیں اور وہاں ہم نے بنی عناق کو بھی دیکھا جو جبار ہیں اور جباروں کی نسل سے ہیں۔

(شارحین بائبل کے مطابق عبرانی لفظ نفیلیم کا ترجمہ ہے معنی، دیو قد، زبردست شخص)[۴] اور ہم تو اپنی ہی نگاہوں میں ایسے تھے جیسے ٹڈے ہوتے ہیں اور ایسے ہی ان کی نگاہ میں تھے۔[۵]

ان جھوٹے قصوں کا ماخذ بیان کرتے ہوئے تفسیر نمونہ کے مؤلفین لکھتے ہیں: ''قوم جبار سے مراد قوم عمالقہ ہے یہ لوگ سخت جان اور بلند قامت تھے یہاں تک کہ ان کی بلند قامتی کے بارہ میں بہت مبالغے ہوئے اور افسانے تراشے گئے۔ اس سلسلہ میں مضحکہ خیز باتیں گھڑی گئی ہیں جن کیلئے کوئی علمی دلیل نہیں۔ خصوصاً عوج کے بارہ میں خرافات سے معمور ایسی کہانیاں تاریخوں میں ملتی ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے افسانے جن میں سے بعض اسلامی کتب میں بھی آ گئے ہیں دراصل بنی اسرائیل کے گھڑے ہوئے ہیں۔[۶]

قاضی ثناء اللہ لکھتے ہیں: ''میں کہتا ہوں عوج بن عنق کا جو تذکرہ بغوی نے لکھا ہے اس میں بہت ہی بعید از عقل مبالغہ ہے۔ علمائے حدیث نے ان خرافات کا انکار کیا ہے۔ صرف اتنی بات ضرور تسلیم کی گئی ہے کہ اس دراز قامت قوم میں عوج سب سے بڑا اور قوی الجثہ شخص تھا''۔[۷]

علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں: ''مفسرین نے یہاں پر وضع کردہ اسرائیلی روایات بیان کی ہیں جو ان جبارین کی درازئ قامت کے بارہ میں ہیں کہ عوج عنق ابن بنت آدم تھا اور اسکا

---

(۴) قاموس الکتاب ص: ۲۸۸ (۵) گنتی ۱۳: ۳۳

(۶) تفسیر نمونہ جلد ۴، ص: ۲۵۹ (۷) مظہری جلد ۳، ص: ۴۳۱

قد تین ہزار تین سو تینتیس گز تھا۔ یہ ایسی باتیں ہیں کہ ان کے ذکر سے حیاء بھی مانع ہے۔ پھر یہ صحیح حدیث کے بھی خلاف ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حضرت آدم علیہ السلام کو ساٹھ ہاتھ کا پیدا کیا گیا پھر مخلوق کے قد کم ہونے لگے۔ ۸

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

قدشاع امر عوج عند العامة ونقلوفيه حكايات شنيعه وفی فتاوی العلامة ابن حجر قال الحافظ العماد ابن كثير: قصة عوج وجميع مايحكون عنه هذيان لااصل له وهو من مختلقات اهل الكتاب.

قال ابن قيم: من الامور التی يعرف بهاكون الحديث موضوعاً أن يكون مماتقوم الشواهد الصحيحة علی بطلانه كحديث عوج الطويل وليس العجب من جرأة من وضع هذاالحديث وكذب علی الله تعالیٰ انّما العجب ممن يدخل هذاالحديث فی كتب العلم من التفسير وغيره ولا يُبيّن امره ثم قال: ولا ريب فی انّ هٰذا وامثاله من وضع زنادقة اهل الكتاب الذين قصدوالاستهزاء والسخرية بالرسل الكرام عليهم الصلاة والسلام واتباعهم انتهٰی. ۹

عوام الناس میں عوج کا قصہ مشہور اور اس ضمن میں نازیبا افسانے نقل کئے گئے ہیں۔

علامہ ابن حجر نے اپنے فتاویٰ میں لکھا کہ حافظ عماد ابن کثیر بیان کرتے ہیں کہ عوج بن عنق کے بارہ میں جتنی روایات بیان کی جاتی ہیں یہ بکواس ہیں، انکی کوئی اصل نہیں، اہل کتاب نے انکو گھڑا ہے۔ علامہ ابن قیم کہتے ہیں کہ حدیث موضوع ہونے کا ایک بڑا ثبوت یہ بھی ہوتا ہے

---

(۸) تفسیر القرآن العظیم جلد۲، ص:۵۴ (۹) روح المعانی جلد۳، ص:۲۵۹

کہ وہ مشاہدۂ صحیح دلیلوں کے خلاف ہو جیسے عوج الطّویل کا قصہ، حیرانی ہے اس پر جس نے اس کو وضع کیا اور اللہ تعالٰی پر افترا کیا۔ ان لوگوں پر حیرت ہے جنہوں نے تفسیر وغیرہ جیسی علمی کتب میں اس واقعہ کو درج کیا اور حقیقت واضح نہ کی۔ اس میں شک نہیں کہ اس طرح کے افسانے اہل کتاب زندیقوں نے وضع کئے ان کا ارادہ انبیائے کرام علیھم الصلوٰۃ والسلام اور ان کے ماننے والوں کا استہزاء ہے۔

قصہ ہاروت و ماروت

قصہ ہاروت و ماروت کا خلاصہ یہ ہے کہ ”بنی آدم کے گناہوں پر فرشتوں نے تعجب کیا اور کہا کہ اے اللہ اگر ان کی جگہ ہم ہوتے تو کبھی تیری نافرمانی نہ کرتے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا کہ تم اپنے میں سے دو فرشتے چن لو، فرشتوں نے ہاروت و ماروت کو چن لیا۔ ان دونوں میں بشری خواہشات پیدا کر کے بصورت بشر انہیں زمین پر اتار دیا گیا وہ لوگوں کے درمیان ان کے مقدمات کا فیصلہ کرتے تھے۔ ایک زہرہ نامی عورت کی وجہ سے وہ فتنہ میں پڑ گئے انہوں نے اس سے اپنی خواہش پوری کرنا چاہی اس نے انکار کر دیا اور کہا کہ اگر تم میری تین باتوں میں سے ایک بات مان لو تو میں تمہاری خواہش پوری کروں گی۔ بت کی پوجا کر لو، شراب پی لو یا ناحق ایک جان کو قتل کر دو۔ انہوں نے اسکی بات مان لی۔ پھر زہرہ نے ان سے وہ عمل سیکھ لیا جس کی وجہ سے وہ آسمان پر چڑھ گئی اور زہرہ ستارے کی صورت میں وہ مسخ کر دی گئی۔ ان دونوں نے بھی آسمان پر چڑھنے کا ارادہ کیا مگر نہ چڑھ سکے تو انہیں اختیار دیا گیا کہ وہ دنیا کا عذاب قبول کر لیں یا آخرت کا، انہوں نے دنیا کا عذاب قبول کر لیا۔[1]

علماء نے متعدد وجوہ سے اس قصہ کو مردود و باطل ٹھہرایا ہے۔

(۱) مجمع البیان جلد اول ص: ۱۷۶/الحسنات جلد اول ص: ۲۱۲

جامع البیان جلد اول ص: ۳۶۳/تفسیر نعیمی جلد اول ص: ۲۷۱ تا ۲۷۳

امام رازی لکھتے ہیں:

واعلم أن هذه الرواية فاسدة، مردودة، غير مقبولة، لانه ليس فى كتاب الله مايدل على ذٰلك.[۲]

جان لو یہ تمام روایت فاسد، مردود اور غیر مقبول ہے، قرآن کریم ان میں سے کسی پر دلالت نہیں کرتا۔

یہ روایات یہود سے نقل کی گئیں (بیضاوی) اور ان میں سے کچھ بھی صحیح نہیں۔[۳]

ہاروت و ماروت کے قصہ میں تابعین کی ایک جماعت سدی، حسن بصری، قتادہ، ابوالعالیہ، زہری، ربیع بن انس، مقاتل بن حیان وغیرھم نے روایات ذکر کی ہیں اور بہت سے متقدمین اور متاخرین مفسرین نے بھی اسکا ذکر کیا ہے۔ اسکا مرجع بنی اسرائیل ہیں کیونکہ اس قصہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث مرفوع صحیح متصل الاسناد مروی نہیں۔[۴]

البدایہ والنہایہ میں امام ابن کثیر لکھتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ اسے اسرائیلیوں نے وضع کیا، امام قرطبی بھی لکھتے ہیں یہ تمام روایات ضعیف ہیں اور ابن عمر سے یہ بعید ہے کہ ایسی روایات بیان کریں اسکے باطل ہونے کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

۱۔ أمنا الله على وحيه وسفراؤه الى رسله.

کہ فرشتے وحی الٰہی کے امین اور رسولوں کی طرف اللہ تعالیٰ کے سفیر ہیں۔

۲۔ ومما يدل على غير صحته أن الله تعالىٰ خلق النجوم وهذه الكواكب حين خلق السماء.

---

(۲) مفاتیح الغیب جلد۳، ص:۲۲۰)

(۳) البحر المحیط جلد اول ص:۵۲۸ (۴) تفسیر القرآن العظیم جلد اول ص:۱۸۸

یہ بات بھی اس قصہ کے باطل ہونے پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان کی تخلیق کے وقت ہی ستارے اور سیارے پیدا کئے۔[5]

شہاب عراقی نے کہا:

جس نے یہ اعتقاد رکھا کہ ہاروت وماروت فرشتوں کوانکی غلطی کی وجہ سے سزا دی جارہی ہے وہ کافر ہے۔[6]

ابن العربی [7]، اسماعیل حقی [8]، علامہ نیشاپوری، ابوالسعود، قاضی ثناء اللہ [9]، محمد بن یوسف صالحی [10]، علامہ احمد سعید کاظمی [11]، پیر محمد کرم شاہ [12]، امین احسن اصلاحی [13]، عبدالماجد دریا آبادی [14] اور دیگر محققین نے باوجود اس کے کہ یہ قصہ کئی سندوں سے مروی ہے اور بعض لوگوں کے خود مشاہدہ کرنے کے ذکر کے باوجود اسے وضعی اور اسرائیلی قرار دیا ہے۔ حافظ ابن کثیر نے حضرات صحابہ وتابعین سے بکثرت روایات نقل کیں اور انہیں بے بنیاد قرار دیا۔

''ہاروت وماروت قرآن سے واضح ہے کہ خدا کے دو فرشتے تھے اس وجہ سے تفسیر کی کتابوں میں ان کے متعلق جو فضول سا قصہ منقول ہے وہ ہمارے نزدیک بالکل ناقابل التفات ہے اور وہ ملکوتی صفات ہی کے ساتھ دنیا میں بھیجے گئے تھے اور ملکوتی صفات کے ساتھ ہی یہاں رہے۔ ان کا علم بھی جیسا کہ عرض کیا گیا ایک جائز اور مفید علم تھا لیکن یہود نے اپنے اخلاق کی پستی

---

(۵) الجامع الاحکام القرآن جلد ۲ ص: ۵۲
(۶) روح المعانی جلد اول ص: ۳۴۰
(۷) احکام القرآن جلد اول ص: ۴۷
(۸) روح البیان جلد اول ص: ۱۹۱
(۹) جلد اول ص: ۱۸۷
(۱۰) مظہری جلد اول ص: ۱۸۷
(۱۱) جلد اول ص: ۲۶۶
(۱۲) ضیاء القران جلد اول ص: ۸۲
(۱۳) تدبر قرآن جلد اول ص: ۶۸۵-۶۸۶
(۱۴) جلد اول ص: ۴۱

اور مذاق کی خرابی کی وجہ سے اس کو بری نیت سے سیکھا اور برے مقاصد ہی میں استعمال کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ علم بھی ان کے ہاں سحر و ساحری کا ایک ضمیمہ بن کے رہ گیا اور اسکی دلچسپیوں میں وہ ایسا کھو گئے کہ کتاب اللہ سے اول تو انہیں کوئی تعلق باقی نہیں رہ گیا اور اگر رہا بھی تو محض عملیات اور تعویذوں کی حد تک کہ فلاں آیت کے پھونکنے سے یہ فائدہ ہوتا ہے اور فلاں آیت کے تعویذ سے یہ اثر پڑتا ہے۔"[15]

(۱۵) تدبر قرآن جلد اول ص: ۶۸۵-۶۸۶

حضرت سلیمان علیہ السلام اور اسرائیلی قصے

قرآن کریم میں آپ کا اسم مبارک 17 مقامات پر آیا ہے[1] اور ہر جگہ ایک عظیم الشان نبی کے شایان شان کردار بیان کیا ہے۔

-☆-

قرآن کریم نے انبیائے کرام کی شان وشوکت کا ذکر کیا جبکہ تحریف شدہ تورات میں انبیاء پر ایسے الزامات لگائے گئے ہیں جو کسی شریف آدمی کیلئے بھی ناگوار ہیں۔ انبیاء کرام علیہم الصلوات والسلام کی عظمت ورفعت کا تو اندازہ ہی نہیں لگایا جاسکتا، قاموس الکتاب مرتبہ ایف ایس خیر اللہ میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارہ میں عیسائی فکر کو اس طرح پیش کیا گیا ہے:

''اگرچہ سلیمان بڑا دانا و بینا تھا تاہم وہ اپنی آخری عمر میں اپنے روحانی جوش کو کھو بیٹھا اور سیاسی فوائد حاصل کرنے اور شہوت پرستی کی زندگی بسر کرنے کے باعث خدا سے دور ہو گیا''۔[۲]

''عورتیں سلیمان کی سب سے بڑی کمزوری تھیں اس نے شادی کے ذریعہ نہ صرف سیاسی اتحاد کئے بلکہ وہ بہت سی اجنبی عورتوں سے محبت کرنے لگا''۔[۳]

سورۂ ص کی آیت ۳۴: وَاَلْقَیْنَا علی کُرْسِیِّہٖ جسداً ثُمَّ اَنَابَ کی تفسیر میں ایسے بے سروپا واقعات نقل کئے ہیں کہ بقول پیر محمد کرم شاہ الازہری ''انکی تردید کی نیت سے بھی نقل کرنا طبع سلیم کو گوارا نہیں۔

(۱) المعجم المفہرس (۲) ص: ۵۳۱ (۳) ص: ۵۳۳

جن لوگوں کو شان نبوت اور مقام سلیمانی کا ادنی سا بھی علم ہے وہ ان خرافات کی تصدیق نہیں کر سکتے۔''۴ے

ان روایات میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا ایک عورت کو جبراً مسلمان کر کے شادی کرنا، آپ کے گھر میں بت کی پوجا ہونا، آپ کی انگوٹھی کا گم ہونا اور شیطان کا آپ کی جگہ تخت پر ۴۰ دن بیٹھنا جیسی نازیبا باتیں ہیں۔۵ے

سید علی نقی لکھتے ہیں: ''تفسیری روایات جو ان امور میں وارد ہوئے ہیں وہ اتنے غیر مستند ہیں کہ ان سے کوئی وثوق حاصل نہیں ہوسکتا''۔۶ے

باقی رہے جھوٹے اور قبیح افسانے کہ جن کا ذکر بعض کتب میں بڑی آب وتاب سے کیا گیا ہے ظاہراً ان کی اصل جڑ تالمود کے یہودیوں کی طرف جاتی ہے اور سب اسرائیلیات اور خرافات ہیں کوئی عقل و منطق انہیں قبول نہیں کرتی۔ ان قبیح افسانوں میں کہا گیا ہے کہ سلیمان کی انگوٹھی کھوگئی تھی یا وہ کسی شیطان نے چھین لی تھی اور خود ان کی جگہ تخت پر بیٹھ گیا تھا وغیرہ وغیرہ۔ یہ افسانے ہر چیز سے قبل انہیں گھڑنے والوں کے انحطاط فکری کی دلیل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ محققین اسلام نے جہاں کہیں ان کا نام لیا ہے ان کے بے بنیاد ہونے کو صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ نہ تو مقام نبوت اور حکومت الٰہی انگوٹھی سے وابستہ ہے اور نہ کبھی یہ مقام اللہ تعالیٰ اپنے کسی نبی سے چھینتا ہے اور نہ کبھی وہ شیطان کو نبی کی شکل میں لاتا ہے چہ جائیکہ افسانہ طرازوں کے مطابق وہ چالیس دن تک نبی کی جگہ بیٹھے اور لوگوں کے درمیان حکومت وقضاوت کرے۔۷ے

امام رازی ان قصص کا رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

(۴) ضیاء القرآن جلد ۴، ص: ۲۴۲ (۵) تفسیر مظہری جلد ۱۰، ص: ۱۱۶-۱۲۲

(۶) فصل الخطاب جلد ۶، ص: ۳۳۳ (۷) تفسیر نمونہ جلد ۱۹، ص: ۲۳۶

واعلم ان اهل التحقیق استبعدوا هذا الکلام من وجوه.[8]

علامہ ابوحیان اندلسی[9]، محمود آلوسی[10]، عبدالماجد دریابادی[11]، ابن کثیر[12] نے ایسے قصوں پر شدید تنقید کی ہے۔

(۸) مفاتیح الغیب جلد ۲۶، ص: ۲۰۸

(۹) البحر المحیط

(۱۰) روح المعانی جلد ۲۶، ص: ۱۹۱

(۱۱) جلد دوم، ص: ۹۱۱

(۱۲) تفسیر القرآن العظیم جلد ۴، ص: ۴۸

حضرت سیدنا یوسف علیہ السلام

(چند تفسیری روایات کا جائزہ)

وقال للذی ظن انه ناجٍ منهما اذكرني عند ربك فانسه الشيطن ذكر ربه فلبث في السجن بضع سنين.[1]

اس آیت کی تفسیر اہل علم نے دو طرح کی ہے:

ایک گروہ کا خیال ہے کہ حضرت سیدنا یوسف علیہ السلام نے وہ قیدی جس کے بارہ میں آپ کا یقین تھا کہ وہ رہا ہونے والا ہے سے کہا کہ جب تو رہائی پالے تو اپنے آقا سے میری مظلومیت کا ذکر بھی کرنا گویا کہ آپ نے ظاہر طور پر استعانت بالغیر فرمائی اس کو قرآن مجید نے اس سے تعبیر کیا ہے کہ شیطان نے یوسف علیہ السلام کو اپنے رب کا ذکر بھلا دیا اس لئے انہیں یہ سزا دی گئی کہ کئی سال جیل میں رہے۔

اس مؤقف کی تائید کیلئے جو روایات پیش کی جاتی ہیں انہیں ابن جریر نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔

حضرت ابن عباس سے منقول روایت اس طرح ہے:

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر یوسف وہ بات نہ کہتے تو اتنی مدت تک قید میں نہ رہتے، یعنی انہوں نے غیر اللہ سے رہائی طلب کی۔[1-1]

---

(1) سورۂ یوسف آیت: ۴۲ (1-1) جامع البیان جز ۱۲، ص: ۲۹۱-رقم الحدیث ۱۴۷۷۹

لیکن یہ روایت شدید ضعیف ہے۔اس کے ایک راوی ابراھیم بن یزید الخوزی کے بارہ میں امام ذھبی نے لکھا ہے:

قال احمدو النسائی: متروک

قال ابن معین: لیس ثقة

وقال البخاری: سکتوا عنه[2]

ایک دوسرے راوی سفیان بن وکیع کے بارہ میں ابوزرعۃ کی رائے ہے کہ اس پر کذب کی تہمت ہے۔[3]

اس وجہ سے ابن کثیر نے اس روایت کے بارہ میں لکھا:

هذاالحديث ضعيف جدا.[4]

اور وہ روایات جو حسن اور قتادہ سے مروی ہیں مرسل ہیں اور ایسے معاملات میں مراسیل کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔[5]

آیت کریمہ کے درج بالا مفہوم کی وضاحت امام بغوی نے اپنی تفسیر معالم التنزیل[6] اور طبرسی نے مجمع البیان[7] میں کی ہے۔

لیکن علماء کے دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ فانسه الشیطن کی ضمیر بادشاہ کے ساقی کی طرف لوٹتی ہے اور مفہوم یہ ہے کہ رہائی پانے والے ساقی کو اپنے آقا کے سامنے یوسف علیہ السلام

---

(۲) میزان الاعتدال جلد اول، ص:۷۵ / لسان المیزان جلد اول، ص:۲۲۶-۶۶۷

(۳) میزان الاعتدال جلد ۲، ص:۱۷۳ (۴) تفسیر القرآن العظیم جلد ۲، ص:۶۲۴

(۵) تفسیر القرآن العظیم جلد ۲، ص:۶۲۴ (۶) جلد ۲، ص:۴۲۸

(۷) جلد ۵، ص:۲۳۵

کا ذکر کرنا شیطان نے بھلا دیا اس طرح آپ کو چند سال قید میں گذارنے پڑے۔

یہ دوسری تفسیر اس آیت کے سیاق وسباق کے عین مطابق ہے تھوڑی دیر پہلے آپ "ارباب متفرقون" کہہ کر اس معاشرہ کی حالت زار پر طعن کرر ہے تھے تو کچھ دیر بعد اپنے رب سے کیونکر غافل ہو گئے۔

علاوہ ازیں وَادَّکَرَ بَعْدَ اُمَۃٍ [8] کا جملہ بھی اس ساقی کے بارہ میں ہے جو نجات پا گیا تھا۔ یہ جملہ نشان دہی کرتا ہے کہ بھولنے والا ساقی تھا نہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام۔ ایک مظلوم شخص کا اپنی رہائی کیلئے دنیوی تدبیر اختیار کرنا خدا سے غفلت اور توکل کے فقدان کی دلیل نہیں لیکن یہاں معاملہ ہی دوسرا ہے۔

اگر واقعی ایسا ہی تھا یوسف علیہ السلام جیل سے آنا چاہتے تھے تو آپ بادشاہ کے فرستادہ سے یہ نہ کہتے:

ارجع الی ربک فسئلہ..........

درحقیقت نبی ہر موڑ پر اور ہر لمحہ اپنے پیغام کو دوسروں تک پہنچانے کیلئے بیتاب ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ جیل میں خواب پوچھنے والوں کیلئے توحید پر ایک پر مغز خطبہ ارشاد فرما دیا۔

اذکرنی میں بھی شاید یوسف علیہ السلام کے پیغام اور کردار کی طرف اشارہ بھی ہو، نہ کہ رہائی کی اپیل۔ اپنے بے داغ کردار کو اپنی دعوت کے ثبوت میں پیش کرنا انبیاء کا طریقہ رہا ہے۔

---

(۸) سورۂ یوسف آیت: ۴۵

محمود آلوسی ۹، ابوحیان ۱۰، ابن کثیر ۱۱، مولانا مودودی ۱۲، سید ریاض حسین شاہ ۱۳، محمد علی صابونی ۱۴ جیسے صاحبان علم نے دوسرے قول کو پسند کیا ہے۔ امین احسن اصلاحی ۱۵، الشیخ احمد رضا خان بریلوی ۱۶، پیر محمد کرم شاہ ۱۷، فتح محمد جالندھری، مولانا محمد جونا گڑھی اور عبداللہ یوسف علی نے اس آیت کا ترجمہ علماء کی دوسری رائے کے مطابق کیا ہے اور یہی تفسیر مقام نبوت سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔

---

(۹) روح المعانی جلد ۱۲، ص: ۳۷۲

(۱۰) البحر المحیط جلد ۵، ص: ۳۱۱

(۱۱) تفسیر القرآن العظیم جلد ۲، ص: ۶۲۴

(۱۲) تفہیم القرآن جلد ۲، ص: ۴۰۵

(۱۳) تبصرہ ص: ۱۲۶

(۱۴) صفوۃ التفاسیر جلد ۲، ص: ۵۲

(۱۵) تدبر قرآن جلد ۴، ص: ۲۱۵

(۱۶) کنز الایمان

(۱۷) جمال القرآن

(ب)

ولقد همت به وهم بھالولا ان رابرھان ربه كذلك لنصرف عنه السوء والفحشاء انه من عبادنا المخلصين.[18]

عزیز مصر کی بیوی نے اس (یوسف علیہ السلام) کا قصد کیا۔ اگر (یوسف علیہ السلام) نے اپنے رب کی برہان نہ دیکھی ہوتی تو وہ بھی عورت کا قصد کرتا۔ ہم نے ایسا ہی کیا تا کہ ہم بدی وقباحت کو (یوسف علیہ السلام) سے دور رکھیں۔ اور وہ ہمارے مخلص بندوں سے ہیں۔

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی تفسیر میں بعض ایسی نازیبا روایات نقل کی ہیں جو عصمت نبوت کے منافی ہیں۔[19]

ان روایات کو نقل کرتے ہوئے بھی انسان شرم محسوس کرتا ہے۔

آیت مبارکہ میں دو جملے ہیں ایک مطلق دوسرا شرطیہ۔

پہلا جملہ ولقد همت به ہے جو ظاہر کرتا ہے کہ عزم وارادہ تحقق پا چکا تھا۔

دوسرا جملہ لولا ان رائ برھان ربه لھم بھا. (آیت زیر بحث میں جملہ کی ظاہری شکل اس طرح ہے وهم بھا لولا ان رابرھان ربه ظاہر ہے اس جملہ میں لفظ لولا کے جواب کی احتیاج ہے لیکن بظاہر جملہ میں اسکا جواب موجود نہیں لہٰذا اسکا جواب مقدر سمجھنا چاہیے اور جوبات جواب محذوف کا قرینہ قرار دی جاسکتی ہے وہی لولا پر مقدم جملہ ہوتا ہے اور وہ ہے جملہ وهم بھا لہٰذا جملہ کی شکل واقعی اس طرح ہوگی لولا ان را برھان ربه لھم بھا) ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مانع یعنی برہان رب کی موجودگی میں ارادہ متحقق نہیں ہوا تھا اور قلب یوسف

(۱۸) سورۂ یوسف آیت:۲۴ (۱۹) الدر المنثور جلد ۴، ص:۵۲۱-۵۲۵

سوچ کی آلودگی سے بھی پاک تھا۔[20]

وہ برہان ربی کیا تھی؟ مفسرین کے کئی اقوال ہیں۔

۱۔ آسمان سے یوسف علیہ السلام کو آواز دی گئی۔

۲۔ یعقوب علیہ السلام نظر آئے۔

۳۔ جبرئیل، یعقوب علیہ السلام کی شکل میں آئے

۴۔ کمرے میں ایک بت تھا۔

۵۔ دیوار پر کتاب اللہ کی آیت دیکھی۔

ایسے حالات میں تو عام آدمی بھی جرم سے باز آ جاتا ہے۔ شان نبوت تو بہت بلند تر ہے۔ بہترین توجیہ وہ ہے جسے امام بغوی نے نقل کیا۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے بھی اسے ہی پسندیدہ قرار دیا۔[21]

وقال جعفر بن محمد الصادق رضی الله عنهما: البرهان النبوة التی اودعها الله فی صدره حالت بینه وبین مایسخط الله عزوجل.[22]

امام جعفر صادق نے فرمایا کہ برہان وہ نبوت تھی جو اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کے سینہ میں ودیعت کردی تھی، یہی نور نبوت اس امر سے مانع ہوگیا جو اللہ تعالیٰ کے ناراض ہونے کا موجب تھا۔

اس آیت مبارکہ کے ضمن میں نقل ہونے والی بے ہودہ روایات کے حوالہ سے علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں: ''ہمارے نزدیک یہ تمام روایات باطل اور مردود ہیں اور وضاعین نے جعلی سند بنا کر ان روایات کو حضرت ابن عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسے صحابہ اور اخیار تابعین کی

(۲۰) تفسیر موضوعی جلد ۵، ص: ۱۶۵-۱۶۶ (۲۱) جلد ۶، ص: ۱۳۹

(۲۲) معالم التنزیل جلد ۲، ص: ۴۲۰

طرف منسوب کر دیا ہے ورنہ ان نفوس قدسیہ کا مرتبہ اس سے بہت بلند ہے کہ وہ حضرت یوسف علیہ السلام ایسے عفت مآب اور مقدس نبی کے متعلق ایسی عریاں اور فحش روایات بیان کرتے۔ غور کیجئے کہ قرآن کریم تو یہ کہتا ہے کہ جب عزیز مصر کی بیوی نے حضرت یوسف علیہ السلام کو دعوت گناہ دی تو انہوں نے فرمایا: اللہ کی پناہ! وہ میری پرورش کرنے والا ہے، اس نے مجھے عزت سے جگہ دی ہے، بے شک ظالم فلاح نہیں پاتے۔ ۲۳ے اور ان وضاعین نے ایسی ننگی خرافات کو حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف منسوب کر دیا، ہمارے نزدیک قرآن مجید کی یہ ایک آیت ہی ان روایات کے رد اور حضرت یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی اور گناہوں سے براءت کے ثبوت کیلئے کافی ہے۔

ہمارے مفسرین چونکہ روایات جمع کرنے کے دلدادہ ہیں اس وجہ سے انہوں نے اپنی تفاسیر میں ان روایات کو درج کر دیا ورنہ ان کے دلوں میں انبیاء علیہم السلام کی عظمت ہم سے بہت زیادہ تھی۔ ۲۴ے

مولانا ادریس کاندھلوی لکھتے ہیں: ''اور بعض مفسرین نے جو اس بارہ میں نازیبا واقعات نقل کئے ہیں وہ سب قطعاً غلط ہیں اور آیت کے سیاق وسباق کے بالکل خلاف ہے۔'' ۲۴-اے

---

(۲۳) سورۂ یوسف آیت: ۲۳

(۲۴) تبیان القرآن جلد ۵، ص: ۷۳۶

(۲۴-ا) معارف القرآن جلد ۴، ص: ۱۱۴

حضرت یوسف علیہ السلام کیلئے خفیہ تدبیر

كذلك كدنا ليوسف

یوں خفیہ تدبیر کر دی ہم نے یوسف کیلئے

دوسری مرتبہ جب برادران یوسف آپ کے پاس غلہ لینے کیلئے آئے تو ان کے ساتھ حسب وعدہ بنیامین بھی تھا۔ آپ بنیامین کو اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے لیکن مصری قانون انکی اجازت نہ دیتا تھا۔ طے یہ پایا کہ بنیامین کے سامان میں شاہی پیالہ رکھ دیا جائے، جب اہل کار پیالہ کو تلاش کریں گے اور وہ تمہارے سامان سے نکل آئے گا۔ اس طرح حضرت یوسف اپنے بھائی کو اپنے پاس رکھ لیں گے۔ یہ خلاصہ ہے اس قصہ کا جو یوسف علیہ السلام کو اپنے بھائی کے حوالہ سے پیش آیا۔ لیکن اس قصہ کو لکھنے کے بعد مفسرین بعض ایسے مباحث میں الجھ جاتے ہیں جو آیات کے سیاق وسباق کے بھی مناسب نہیں اور عظمت یوسف کے شایان شان بھی نہیں۔ سوال اس طرح کے ہیں:

۱۔ قافلہ والوں کو چور کہنے کی توجیہہ ۲۔ حیلہ کا جواز

لیکن درج ذیل وضاحت کو پیش نظر رکھا جائے تو اس صورت میں لایعنی مباحث میں الجھے بغیر آیات کے سیاق وسباق کے مطابق وضاحت ہو جاتی ہے۔

قرآن کریم کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ پہلی مرتبہ بھائی آئے تو یوسف علیہ السلام نے اپنے کارندوں کو کہہ کر غلہ کی قیمت اپنے بھائیوں کے سامان میں رکھوا دی لیکن دوسری مرتبہ بنیامین

بھی ہمراہ آیا تو حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنا پیالہ اپنے بھائی کے سامان میں خود رکھا۔

جعل السقاية فی رحل اخيه. ۲۵

یہاں حضرت یوسف علیہ السلام کے پیش نظر یہ نہ تھا کہ وہ اس حیلہ سے بھائی کو اپنے پاس رکھ لیں گے آپ نے از راہِ ہمدردی ایسا کیا۔ کنعانی قافلہ روانہ ہوئے تھوڑی ہی دیر گذری تھی کہ کارندوں نے شاہی پیالہ کو موجود نہ پایا فوراً سمجھ گئے کہ یہ حرکت اس قافلہ والوں نے نہ کی ہو۔ فوراً چلائے کہ قافلہ والوں! تم چور ہو (یہاں ان توجیہات پر نظر ڈالنی چاہیے جو قافلہ والوں کو چور کہنے کے سلسلہ میں کی گئی ہیں)۔ ۲۶

گفت وشنید کے دوران جب شاہی کارندوں نے قافلہ والوں سے کہا: اگر شاہی پیالہ تمہارے سامان سے برآمد ہوا تو اسکی کیا سزا ہے؟ تو قافلہ والوں نے کہا کہ اسے تمہارے حوالہ کر دیا جائے گا کیونکہ ہمارے ہاں ایسے شخص کی یہی سزا ہے۔ بنیامین کے سامان سے پیالہ نکلا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس قضیہ آیا تو آپ بہت خوش ہوئے قدرت نے ایسا سبب مہیا کر دیا کہ یوسف بھائی کو اپنے پاس رکھ لیں۔ اس کے بعد بطور انعام اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ یوسف کی خواہش کو پورا کرنے کیلئے ہم نے سبب پیدا کر دیا۔ كذلك كدنا ليوسف کا یہی مفہوم ہے۔

درج بالا سطور کی روشنی میں یہ واضح ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے بنیامین کو روکنے کیلئے توریہ سے کام لیا نہ کوئی حیلہ کیا۔ اذن مؤذن میں پکارنے والی شخصیت بھی یوسف نہیں۔

اگر مصری قانون میں چور کی سزا یہ ہوتی کہ اسے غلام بنا کر رکھا لیا جاتا تو بلاشبہ اس حیلہ کا تصور ذہن میں آسکتا تھا۔ یہاں تو بعد میں خود بھائیوں نے کنعانی دستور کے مطابق سزا تجویز کی۔

---

(۲۵) سورۂ یوسف آیت: ۷۰

(۲۶) تبیان القرآن جلد ۵، ص: ۸۲۰

حضرت یوسف علیہ السلام کو فروخت کرنا

سورۂ یوسف کی آیت ۲۰: وشروه بثمن بخس دراهم معدودة.

(اور بھائیوں نے) یوسف کو چند درہموں کی حقیر سی رقم پر بیچ ڈالا۔

آئمہ تفسیر کا اس بارہ میں اختلاف ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو کتنے درہم میں فروخت کیا گیا۔ بعض نے بیس، بعض نے بائیس اور کچھ نے چالیس درہم نقل کئے ہیں۔ [۲۷]

بیچنے والوں کو آپ کی قیمت سے کوئی غرض نہ تھی وہ تو یہ چاہتے تھے کہ یوسف علیہ السلام کسی طرح اس علاقے سے نکل جائیں۔

امام طبری ان روایات کے بارہ میں لکھتے ہیں: ''اس بارہ میں صحیح بات یہ کہی جائے گی کہ یوسف علیہ السلام کو بیچنے والوں نے اسے چند درہم کے بدلے فروخت کر دیا جو غیر موزوں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو نہ تعداد میں بیان کیا ہے اور وزن میں بیان کیا ہے۔

اس بارہ میں قرآن اور حدیث رسول میں کچھ نہیں بتایا گیا ہوسکتا ہے وہ بائیس ہوں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ چالیس ہوں ان سے کم بھی ہوسکتے ہیں اور زیادہ بھی۔ جتنے بھی تھے غیر موزوں تھے۔ ان کے وزن کا تعین کرنے سے دین کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا اور ان کے معلوم نہ ہونے سے کوئی نقصان واقع نہیں ہوتا۔ قرآن کے ظاہری الفاظ پر ایمان فرض ہے اس کے علاوہ جو اقوال ہیں ان کا جاننا ہمارے لئے ضروری نہیں۔'' [۲۸]

---

(۲۷) تفسیر القرآن العظیم جلد ۲، ص: ۶۱۵، تفسیر مظہری جلد ۶، ص: ۱۳۳

(۲۸) جامع البیان جلد ۷، ص: ۱۳۵

حضرت یونس علیہ السلام اور اسرائیلی قصے

حضرت یونس علیہ السلام کے بارہ میں معروف یہ ہے کہ آپ اپنی قوم سے مایوس ہو کر نکلے تو قوم کیلئے تین دن (چالیس دن) کی مہلت مقرر کردی کہ ان دنوں میں عذاب آ جائے گا۔

تین دن یا چالیس دن کی مہلت کی روایت درج ذیل کتب تفاسیر میں ہے:

زادالمسیر [۱]، جامع البیان [۲]، مفاتیح الغیب [۳]، تبیان القرآن [۴]، ضیاء القرآن [۵]، تفہیم القران [۶] تفسیر عثمانی

مرزا قادیانی نے اس روایت کی بنیاد پر یہ مؤقف اختیار کیا کہ اگر میری پیشین گوئیاں صحیح ثابت نہیں ہوئیں تو یونس علیہ السلام کا فرمایا بھی کب پورا ہوا۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کی کسی آیت یا کسی صحیح حدیث میں ایک بھی روایت ایسی نہیں جس سے پتہ چلتا ہو کہ حضرت یونس علیہ السلام تین دن یا چالیس دن کی مدت مقرر کر گئے تھے آپ نے اپنی طرف سے عذاب کیلئے کسی مدت کا تعین نہیں کیا۔

حضرت یونس علیہ السلام ہی کے قصہ سے قادیانی یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہمارے مخالفین کو مرزا کی پیشین گوئیوں کے مطابق عذاب اس لئے نہیں آیا کہ انہوں نے دل میں

---

(۱) جلد ۴، ص: ۹۸ (۲) جلد ۱۱، ص: ۲۲۲

(۳) جلد ۶، ص: ۳۰۳ (۴) جلد ۵، ص: ۴۷۴

(۵) جلد ۴، ص: ۲۱۶ (۶) جلد ۴، ص: ۳۱۰

عذاب کے آثار دیکھ کر قوم یونس کی طرح توبہ کرلی تھی۔ انکا استدلال اس آیت سے ہے: فلولا کانت قریة اٰمنت فنفعها ایمانها الاقوم یونس لما اٰمنوا کشفنا عنهم عذاب الخزی فی الحیوة الدنیا ومتعنٰهم الی حین. ۷

عموماً اس آیت کا ترجمہ اس طرح کیا جاتا ہے:

تو کوئی بستی ایسی کیوں نہ ہوئی کہ وہ (عذاب کی نشانی دیکھ کر) ایمان لے آتی تو اسکا ایمان اسکو نفع دیتا سوائے یونس کی قوم کے کہ جب وہ ایمان لے آئی تو ہم نے اس سے دنیا کی زندگی میں ذلت کا عذاب دور کردیا اور ہم نے ان کو ایک وقت مقرر تک فائدہ پہنچایا۔ (ترجمہ غلام رسول سعیدی)

حالانکہ اس آیت کا صاف اور واضح مفہوم تو یہ تھا کہ جس طرح قوم یونس ایمان لے آئی اسی طرح اور بستیوں نے بھی کیوں ایمان قبول نہ کیا تا کہ جس طرح قوم یونس عذاب سے محفوظ رہی اسی طرح وہ سب بھی عذاب سے محفوظ رہتیں۔

گویا اس آیت میں ایک طرف تو قوم یونس کی مدح کی گئی ہے اور دوسری طرف ان قوموں پر ناراضگی کا اظہار ہے جنہوں نے خود کو ایمان لا کر عذاب سے نہ بچایا۔ اس مفہوم کی تائید مغنی اللبیب کی اس عبارت سے ہوتی ہے:

"والظاهر أن المعنی علی التوبیخ، ای فهلا کانت قریة واحدة من القری المهلکة تابت عن الکفر قبل مجیء العذاب فنفعها ذلک، وهو تفسیر الاخفش والکسائی والفراء وعلی بن عیسی والنحاس، ویؤیده قراءة أبی وعبدالله (فهلا کانت) ویلزم من هذا المعنی النفی؛ لان التوبیخ یقتضی عدم الوقوع". ۸

---

(۷) سورۂ یونس آیت: ۹۸ (۸) مغنی اللبیب لابن هشام جلد اول ص: ۲۷۵

اور ظاہر ہے کہ آیت کا معنی توبیخ پر دلالت کرتا ہے یعنی کیوں نہ ایسا ہوا کہ ہلاک ہونے والی بستیوں میں سے کوئی بستی عذاب آنے سے پہلے توبہ کرتی تو ان کا ایمان ان کو نفع دیتا اور یہ اخفش، کسائی، فراء، علی بن عیسی اور نحاس کی اختیار کردہ تفسیر ہے اور قرأت ابی اور عبداللہ بھی اسکی تائید کرتے ہیں (فھلا کانت) اور اس معنی سے نفی لازم آتا ہے کیوں کہ توبیخ سے ظاہر ہے کہ ایسا واقع نہیں ہوا۔

امام رازی کی اس عبارت سے بھی درج بالا مفہوم کی تائید ہوتی ہے:

''والمعنی ھلا کانت قریة من القری التی اھلکناھاتابت عن الکفر واخلصت فی الایمان قبل معاینة العذاب الاقوم یونس.[9]

بہت سے لایعنی سوالات سے بچنے کیلئے اس مفہوم کو ترجیح دینی چاہیے۔

عصر حاضر کے نامور مفسر ومحدث حضرت علامہ غلام رسول سعیدی مدظلہ العالی بھی عام مفسرین کی روش پر چلتے ہوئے اسی مفہوم کو ترجیح دی جس سے لایعنی سوالات کا ایک طولانی سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ حالانکہ امام قرطبی کا مفہوم درست ہے جسکا سعیدی صاحب نے رد کیا ہے۔ علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں:

''ہر چند کہ علامہ قرطبی کی تحقیق یہ ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کی قوم نے عذاب کی علامات دیکھنے سے پہلے توبہ کرلی تھی لیکن ظاہر قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے عذاب کی علامات اور نشانیاں دیکھ کر توبہ کی تھی یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یونس کی قوم کا باقی اقوام سے استثناء کیا ہے اور باقی مفسرین کا بھی یہی مختار ہے''۔

حالانکہ قران کے ظاہر سے جو مفہوم مترشح ہوتا ہے وہ یہ ہے:

(۹) مفاتیح الغیب جلد ۱۷، ص: ۱۶۵

''پس کیوں نہ ہوا کہ کوئی بستی ایمان لاتی کہ اسکا ایمان اسکو نفع دیتا بجز یونس کی قوم کے، جب وہ ایمان لائے تو ہم نے ان سے دنیا کی زندگی میں رسوائی کے عذاب کو دور کردیا''۔(ترجمہ امین احسن اصلاحی)

گویا آثار دیکھ کر توبہ نہیں کی بلکہ اس سے پہلے ہی توبہ کیلئے بارگاہ ایزدی میں حاضر ہو گئے، اسی پر اس قوم کی مدح کی گئی۔

مائدہ پر کون سے کھانے تھے؟

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعاء سے نازل ہونے والے مائدہ میں کیا تھا۔ مختلف آراء ہیں ایک قول روٹی اور مچھلی کا ہے، دوسرا جنت کے پھل ہے۔ یہ بھی کہا گیا کہ جو کی روٹی اور مچھلی تھی۔

امام طبری ان اقوال کے بارہ میں لکھتے ہیں:

''دستر خوان پر کون کون سے کھانے تھے؟ اس بارے میں صحیح قول یہ کہنا چاہیے کہ اس پر ماکولات تھیں۔ وہ مچھلی اور روٹی بھی ہوسکتی ہے، وہ جنت کے پھل بھی ہو سکتے ہیں۔ ان کے جاننے سے علم میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا اور نہ جاننے سے کوئی نقصان نہیں ہوتا۔[1]

(۱) جامع البیان جلد ۷، ص: ۱۳۵

اے میرے کریم اللہ!

انبیاء کرام علیھم السلام کی عظمت وشوکت اورقرآن کریم کی رفعت ومنزلت کے حوالہ سے لکھے گئے ان کلمات کوقبول فرما۔ ان کو میری، میرے والدین، اہل خانہ، کمپوزرو ناشر کی مغفرت کاذریعہ بنا۔

رَبِّ اَوْ زِعْنِیْ اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَکَ الَّتِیْ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحاً تَرْضَاہُ وَاَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْکَ وَاِنِّیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ اَللّٰھُمَّ اشْرَحْ صَدْرِیْ بِالْعُلُوْمِ اللّٰدُنِّیَّۃ وَامْلَأْ قَلْبِیْ بِالْمَعَارِفِ الرَّبَّانِیَّۃ وَاسْعِدْنِیْ بِخِدْمَۃِ دِیْنِکَ الْحَنِیْفِ. آمِیْن یَارَبَّ الْعَالَمِیْنَ بِبَرَکَۃِ اَسْمَائِکَ الْحُسْنٰی وَبِبَرَکَۃِ نَبِیِّکَ الْمُرْتَضٰی.

محمد ھمایوں عباس شمس

جی سی یونیورسٹی لاہور

۱۵ جولائی ۲۰۰۳

ماخذ و مراجع

۱۔	ارشاد الساری	احمد قسطلانی (متوفی ۹۱۱ھ)
۲۔	اسرائیلیات فی التفسیر والحدیث	الدکتور محمد حسین الذھبی
۳۔	البدایہ والنھایۃ	ابن کثیر (۷۷۴ھ)
۴۔	الاسرائیلیات والموضوعات فی کتب التفسیر	محمد بن ابوشھبہ
۵۔	السیرۃ النبویۃ فی ضوء القرآن والسنۃ	محمد بن ابوشھبہ
۶۔	التحریر والتنویر	ابن عاشور (۱۳۸۰ھ)
۷۔	الروض الانف	ابو القاسم عبد الرحمٰن بن عبد اللہ سہیلی ۵۷۱
۸۔	انسان العیون	علی بن برہان الدین حلبی (۱۰۴۴)
۹۔	الوسیط فی تفسیر القرآن المجید	امام ابو الحسن علی بن احمد الواحدی ۴۶۸
۱۰۔	الدر المنثور	علامہ جلال الدین سیوطی (۹۱۱)
۱۱۔	التبیان	علامہ احمد سعید کاظمی (۱۴۰۶)
۱۲۔	الجامع لاحکام القرآن	ابو عبد اللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی ۶۶۸ھ
۱۳۔	المحرر الوجیز	علامہ ابو بکر قاضی عبد الحق بن غالب ۵۴۶
۱۴۔	المستدرک	ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ حاکم نیشاپوری ۴۰۵
۱۵۔	الفتح الربانی	
۱۶۔	البحر المحیط	ابو حیان محمد بن یوسف اندلسی ۷۵۴ھ
۱۷۔	بصائر ذوی التمییز فی لطائف الکتاب العزیز	مجد الدین فیروز آبادی (۸۱۷)

۱۸۔	بدائع الزھور فی دقائع الدھور	محمد بن احمد ابن ایاس حنفی
۱۹۔	تفسیر الحسنات	ابوالحسنات سید محمد احمد قادری
۲۰۔	تفسیر مظہری	قاضی ثناء اللہ پانی پتی (متوفی ۱۲۲۵)
۲۱۔	تہذیب الکمال	حافظ جمال الدین ابوالحجاج یوسف مزی ۷۴۲
۲۲۔	تہذیب التہذیب	ابن حجر عسقلانی (۸۵۲)
۲۳۔	تفسیر المنار	محمد رشید رضا (۱۳۵۴)
۲۴۔	تفسیر الشعراوی	علامہ متولی الشعراوی
۲۵۔	تفسیر نمونہ	مکارم شیرازی
۲۶۔	تفہیم القرآن	سید ابوالاعلی مودودی (۱۳۹۹)
۲۷۔	تفسیر نعیمی	مفتی احمد یار خاں نعیمی (۱۳۹۱)
۲۸۔	تفسیر موضوعی	جعفر سبحانی
۲۹۔	تدبر القرآن	امین احسن اصلاحی
۳۰۔	تفسیر القرآن العظیم	حافظ عماد الدین اسماعیل بن عمر بن کثیر ۷۷۴
۳۱۔	تفسیر المراغی	احمد مصطفیٰ المراغی
۳۲۔	تفسیر ماجدی	عبدالماجد دریابادی
۳۳۔	تفسیر القران العزیز	امام عبدالرزاق (۲۱۱ھ)
۳۴۔	تہذیب الاسماء واللغات	علامہ یحیٰ بن شرونووی (۶۷۶ھ)
۳۵۔	جامع البیان	امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری ۳۱۱ھ
۳۶۔	حاشیہ شبیر عثمانی	علامہ شبیر احمد عثمانی (۱۳۶۹)

۳۷۔	خطبات احمدیہ	سر سید احمد خاں (۱۸۹۸ھ)
۳۸۔	روح المعانی	علامہ محمود آلوسی حنفی (۱۲۷۰ھ)
۳۹۔	رحمۃ للعالمین	قاضی سلمان منصور پوری (۱۹۳۰ھ)
۴۰۔	روح البیان	علامہ اسماعیل حقی (۱۱۳۷ھ)
۴۱۔	زادالمسیر	عبدالرحمٰن بن علی بن محمد جوزی (۵۹۷)
۴۲۔	سنن الترمذی	امام ابوعیسی محمد بن عیسی ترمذی ۲۷۹ھ
۴۳۔	سلسلة الاحاديث الضعيفه والموضوعة	ناصر الدین البانی
۴۴۔	سبل الھدی والرشاد	علامہ محمد بن یوسف الصالحی الشامی ۹۴۲
۴۵۔	صحیح البخاری	محمد بن اسماعیل بخاری ۲۵۶ھ
۴۶۔	صفوۃ التفاسیر	محمد علی صابونی
۴۷۔	صبح الاعشی	
۴۸۔	ضیاء القرآن	پیر محمد کرم شاہ الازھری
۴۹۔	ضیاء النبی	پیر محمد کرم شاہ الازھری
۵۰۔	عمدۃ القاری	حافظ بدرالدین محمود بن احمد عینی ۸۵۵
۵۱۔	فتح الباری	حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی ۸۵۲
۵۲۔	فتح القدیر	محمد بن علی شوکانی (۱۲۵۰)
۵۳۔	فصل الخطاب	علامہ علی نقی
۵۴۔	قاموس الکتاب	ایف ایس خیر اللہ
۵۵۔	قصص الانبیاء	عبدالوہاب النجار

٥٦۔	قصص القرآن	حفظ الرحمان سیوہاروی
٥٧۔	لسان المیزان	ابن حجر عسقلانی (٨٥٢ھ)
٥٨۔	میزان الاعتدال	شمس الدین محمد بن احمد ذہبی ٧٤٨ھ
٥٩۔	مغنی اللبیب	ابن ھشام
٦٠۔	معارف القرآن	مفتی محمد شفیع (١٣٩٦ھ)
٦١۔	معالم التنزیل	امام ابو محمد الحسین بن مسعود القراء البغوی ٥١٦
٦٢۔	محاسن التاویل	محمد جمال الدین قاسمی (١٣٣٢ھ)
٦٣۔	مسند احمد	امام احمد بن حنبل (٢٤١ھ)
٦٤۔	مجمع البیان	ابو علی فضل بن حسن طبرسی (٥٤٨ھ)
٦٥۔	معجم البلدان	علامہ اسماعیل حقی (١١٣٧ھ)
٦٦۔	مدارج النبوۃ	شیخ عبد الحق (١٠٥٢ھ)
٦٧۔	مترادفات القرآن	عبد الرحمٰن کیلانی (١٩٩٥ء)
٦٨۔	مدارک التنزیل وحقائق التاویل	ابو البرکات احمد بن محمد نسفی (٧١٠ھ)
٦٩۔	مفاتیح الغیب	امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی ٦٠٦ھ
٧٠۔	نہج البلاغۃ	خطبات حضرت علی رضی اللہ عنہ

-☆-

سنگت پبلشرز کی نئی مطبوعات

1-القرآن الکریم (پنجابی ترجمہ، دو جلدیں)	شریف کنجاہی	600/-
2- انوار القرآن (قرآن کریم کی تفسیری لغات)	مولانا عبدالرحمٰنؒ	350/-
3-انوار التفسیر (تیسواں پارہ)	مولانا عبدالرحمٰنؒ	120/-
4- محبوب خدا	چوہدری افضل حقؒ	60/-
5-دین اسلام	چوہدری افضل حقؒ	60/-
6- لبیک	ممتاز مفتیؒ	120/-
7- البیرونی کا ہندوستان	مرتبہ: قیام الدین احمد	170/-
8- چند اہم جدید شاعر	ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا	140/-
9- اصول تحقیق و ترتیب متن	ڈاکٹر تنویر احمد علوی	300/-
10- فکر و فن اقبال	مرتبہ: ڈاکٹر شگفتہ زکریا	120/-
11- جاٹ قدیم حکمران	بی ایس ڈاہیا / ترجمہ: صاحبزادہ عبدالرسول	350/-
12- متنی تنقید	خلیق انجم	60/-
13- مطالعہ کشمیر	سجاد لطیف	250/-
14- لیکھ	حفیظ تائب	80/-
15- ویر توں کنجاہ دا ایں	انٹرویو: خالد ہمایوں	120/-
Islam and Women -16	Ali Asghar Chishti	80/-